آیات روزہ و دعا

(مع ضمیمہ مترجم)

تفسیر المیزان

علامہ سید محمد حسین طباطبائی

مترجم ڈاکٹر محمد حسن رضوی

maablib.org

اسلامک کلچر اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ، عائشہ منزل چوک شاہراہ پاکستان فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

تفسیر المیزان

محترم سید [illegible] صاحب فرزند رضا [illegible] حفظہ اللہ

[illegible]

علامہ سید محمد حسین طباطبائی

Recd 18 5/1988
۱۹۸۸

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

نام کتاب : تفسیر المیزان "آیات روزہ و دُعا"

مؤلف : علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ

مترجم : ڈاکٹر سید محمد حسن رضوی

ناشر : ادارۂ احیاءِ تراث اسلامی و اسلامک کلچر اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ پاکستان

سن طباعت : اپریل ۱۹۸۸ء — تعداد : تین ۳ ہزار

کیلی گرافی / کتابت : کاشانۂ کتابت مہتمم تہذیب بن جری

قیمت — دس روپیہ

احمد بُک سیلرز و اسٹیشنرز
اسٹاکسٹ و جنرل آرڈر سپلائرز
۱۶/۲۰،۷ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی ۳۸
فون — ۶۸۳۹۲۴

فہرست

قرآن کا تعارف	۷
تعارف تفسیر المیزان	۹
اہمیت دعا	۱۲
قبولیت دعا کی شرط	۱۶
دعا کی اہمیت اور طریقہ	۲۱
روایات پر بحث	۲۳
اعتراض کا جواب	۳۶
روزہ	۴۲
صیام کے معنی	۴۷
عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ	۴۸
گنتی کے کچھ دن	۴۹
سورۃ الدخان	۶۰
روایات پر بحث	۶۹
الصوم ضمیمہ از مترجم	۷۷
آیت کے الفاظ کا تفصیلی مطالعہ	۸۳

عرض ناشر

ادارہ احیاء تراث اسلامی کے قیام کو ابھی چند سال ہی ہوئے ہیں لیکن جس والہانہ انداز میں عوام الناس نے ادارہ کی شائع کردہ کتب پسند کی ہیں، نہایت حوصلہ افزا بات ہے۔ ادارہ کے لئے علامہ سیّد محمد حسین طباطبائی کی تفسیر المیزان طویل عرصے سے باعث کشش بنی ہوئی تھی، کہ اس تفسیر کا اردو ترجمہ عوام تک پہنچایا جائے۔ خدا کی مدد سے یہ مشکل خود ہی آسان ہوگئی اور ڈاکٹر سیّد محمد حسن رضوی صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ تفسیر المیزان کا ترجمہ وہ کرتے ہیں ادارہ اس کو شائع کرے، ادارہ کی تو گویا دلی مراد بر آئی۔

پہلا حصہ جو آیات روزہ و دعا پر مبنی ہے پیش کیا جارہا ہے جس عقیدت اور جانفشانی سے ڈاکٹر حسن صاحب نے ترجمہ کیا ہے اس کا اندازہ قاری کی آرا کے بعد ہی ہوگا لیکن خاص طور پر جو ضمیمہ مرتب کیا ہے قابلِ تحسین ہے۔ ہم ڈاکٹر محمد حسن صاحب اور اسلامک کلچر اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے منتظمین کے مشکور ہیں کہ انھوں نے ادارہ کو اس فرض کی ادائیگی کے لئے منتخب کیا۔

ناظم ــــ ادارہ احیائے تراث اسلامی

قرآن کا تعارف

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا۔
"جب کالی رات کی طرح فتنے تمہارے لئے اللہ اور نجات کی راہ کو مشتبہ کر دیں تو تم قرآن سے وابستہ ہو جانا کہ وہ شافع ہے اور اس کی شفاعت مقبول ہے۔ قرآن اللہ کا تصدیق یافتہ ہے جو اسے اپنا امام بنائے گا تو یہ اسے بہشت کی طرف لے جاتا ہے اور جو اسے پس پشت ڈال دے تو اسے جہنم کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ قرآن ایسی دلیل ہے جو بہترین راہ کیطرف رہنمائی کرتی ہے۔ یہ وہ مفصل کتاب ہے جو حق کو باطل سے جدا کرنے والی ہے۔ یہ کتاب بیان ہے جو ظاہر اور باطن رکھتی ہے۔ اس کا ظاہر حکمت اور باطن علم ہے۔ اس کا ظاہر خوبصورت و عجیب اور اس کا باطن گہرا اور عمیق ہے۔ اس کی علامات ہیں اور اس کی علامات پر بھی علامات ہیں۔ اس کے عجائب ناقابلِ شمار اور اس کے غرائب ہمیشہ تازہ اور تابندہ ہیں۔ اس میں ہدایت کے چراغ اور حکمت کے مینار ہیں۔ ہر صاحب انصاف کے نزدیک قرآن ہر اچھے فعل کی دلیل ہے۔ لہٰذا ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی نگاہ قرآن کے مطالب

ومعانی پر مرکوز رکھے۔ اور اپنے کو اُن صفات سے آراستہ و پیراستہ کرے جو
اس کا مطلوب ہے۔ تاکہ اُسے ابدی ہلاکت اور بربادی کا سامنا کرنا پڑے
اور اسے گمراہی سے نجات ملے۔ کیوں کہ تفکر ہی قلب بصیر کی اصل زندگی
ہے۔ اور قرآن ہی وہ روشنی ہے جسے چلنے والا اندھیروں میں لے کر چلے۔
یہی بہترین نجات دہندہ اور کم سے کم انتظار کرانے والا ہے۔"

(الحدیث)

maablib.org

تعارف تفسیر المیزان

تفسیر المیزان عہدِ حاضر کی نہایت علمی تحقیقی دقیق اور معتبر ترین تفسیر ہے جسے استاد الاساتذہ، بزرگ و محترم، حضرت علامہ محمد حسین طباطبائیؒ نے اپنی آخری عمر میں تالیف فرمایا جو ان کی زندگی بھر کے علم و تجربہ کا نچوڑ اور سب سے بڑا کارنامہ ہے موصوف خود اپنی طرزِ تفسیر کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ میں فرمایا" قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کا بیان (تفسیر) ہے اور اس کا بعض بعض کا شاہد ہے۔"

یہی وہ منفرد راہِ ہدایت ہے جس پر معلمین قرآن اور ہادیان کرام کاربند رہے ہیں۔ ہم بھی اللہ کی مدد اور حمایت سے قرآن کی آیاتِ کریمہ کے ابحاث و تفسیر میں اسی طریقے کو پیشِ نظر رکھیں گے اور کسی بھی نظری یا فلسفی دلیل، علمی مفروضے، یا عرفانی مکاشفے پر تکیہ نہیں کریں گے۔ البتہ وضاحت کے لئے ایسے مقدمات بدیہی اور علمی پیش کریں گے جن سے لوگوں کے ذہن متردد نہ ہوں اور قرآن فہمی آسان ہو جائے۔ ادبی طور پر لفظ یا جملے کی صرف اتنی ہی توضیح کریں گے جس کی رسول اللہؐ نے تعلیم فرمائی کیوں کہ انہیں خود خدا نے قرآن کا معلم بنایا ہے۔"

اس طریقے پر کاربند رہتے ہوئے مؤلف موصوف نے اللہ تعالیٰ کے

صفات وافعال، اسماءِ الٰہیہ کے معارف، تخلیقِ کائنات کے رموز، انسان اور اللہ سے تعلقات کے دقائق، دنیوی اور اخروی زندگی کے حقائق، اخلاق و فضائلِ انسانی کے مکارم، اولیاءِ خدا کے مقامات کو نہایت علمی رنگ میں بیان کرتے ہوئے شیعہ سنی دونوں کی معتبر ترین احادیث کے حوالے دیئے ہیں اور ان پر نہایت دقیق عالمانہ محققانہ تبصرے فرمائے ہیں جن کی مثال جدید تفاسیر میں ملنی محال ہے۔ نیز علمی و فلسفی ابحاث کو علیحدہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

عرصۂ دراز سے مجھے اردو زبان میں ایسی دقیق، علمی، تحقیقی تفسیر کی نہایت کمی محسوس ہوتی تھی۔ حال ہی میں ہمارے ادارے کے ڈائریکٹر محترم بزرگ جناب پروفیسر کرار حسین صاحب مدظلہ، نے مجھے یہ ہدایت فرمائی کہ "تفسیر المیزان" کی "منتخب علمی اور فلسفی ابحاث" کا اردو ترجمہ کرایا جائے۔ ان کی یہی تجویز اس ترجمہ کا باعث بنی۔ پہلے میں نے سال بھر سر توڑ کوشش کی کہ کوئی دوسرا اس بار کو اٹھائے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ تو پھر خود ہی اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ اس طرح کہ پہلے چند ایسی آیات اور سورتوں کا انتخاب کیا جو قرآنِ مجید کے مرکزی مباحث پر مشتمل ہوں اور مولف نے ان زیرِ قلم تو بحث کی ہو اور پھر ان آیات اور سورتوں کی مکمل تفسیر کو مع علمی و فلسفی مباحث کے عربی متن سے ترجمہ کرنا شروع کیا تاکہ یہ ترجمہ، قرآن کے بنیادی مباحث کے تفصیلی مطالعہ کا بہترین اور مفید ترین ذریعہ ثابت ہو۔

اپنے اوپر ایسی کڑی ذمہ داری لینے کے بعد اب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی بھروسہ ہے کہ وہ اپنے کرم بے پایاں سے، اپنے اولیاءِ کرامؑ کے تصدق میں، اس سخت ترین کام کو انجام تک پہنچانے کی توفیقات

عطا فرمائے اور اِس ادنیٰ سے عمل کو ایک ایسا عمل صالح قرار دے کہ جس کے سبب وہ (میرا رب) مجھ گناہگار سے راضی ہو جائے۔ (ان اعمل صالحاً ترضاہ) اگرچہ میں اِس کا اہل تو نہیں ہوں۔

؎ شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

بندۂ ناچیز

مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۸۴ء — ڈاکٹر محمد حسن رضوی

ڈپٹی ڈائریکٹر

اسلامک کلچر اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ شاہراہ پاکستان کراچی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا

ترجمہ:۔ "(اے رسولؐ) جب میرے بندے میرا حال تم سے پوچھیں (تو کہہ دو کہ) بلاشبہ میں تو ان کے پاس ہی ہوں، اور جب کوئی مجھ سے دعا مانگتا ہے تو میں ہر دعا کرنے والے کی دعا سن لیتا ہوں۔ اور قبول کرتا ہوں۔ پس انھیں چاہیئے کہ میرا ہی کہا مانیں اور مجھ ہی پر بھروسہ کریں۔ تاکہ وہ سیدھی راہ پر آجائیں" (بقرہ ۱۸۶)

تفسیر

اہمیتِ دعا

یہ آیت اپنے مضمون کے اعتبار سے بہترین اسلوب اور اندازِ بیان کی حامل ہے مثلاً۔

۱ــــ کلام کا مدار پوری آیت میں متکلم کے صیغہ پر ہے۔ کہیں بھی غائب کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا۔ (یعنی کہیں یہ نہیں فرمایا کہ وہ اللہ دعا کو سن لیتا ہے اور وہ قبول کرتا ہے) بلکہ یہ فرمایا کہ میں ان کے پاس ہی ہوں۔ اور جب کوئی مجھ سے دعا مانگتا ہے تو میں..... الخ" اس اسلوبِ بیان سے محبت، کمالِ قرب، کمالِ توجہ اور کمالِ عنایت کا پتہ چلتا ہے۔

۲ ـــــ فرمایا "عبادی" (میرے بندے) اس کے بجائے الناس (لوگ) یا کوئی اور لفظ نہیں فرمایا۔ اس لفظ میں بھی کمالِ تعلق اور اپنائیگی محسوس ہوتی ہے۔

۳ ـــــ کسی واسطے کا ذکر نہیں کیا بلکہ فرمایا فانی قریب (یقیناً میں تو تمہارے پاس ہی ہوں) اس طرح کم از کم دعا کی حد تک تو براہِ راست تعلق کا مژدہ سنایا۔

۴ ـــــ پھر انی قریب (میں تو قریب ہی ہوں) کے اعلان پر اِنَّ کے لفظ سے تاکید فرمائی۔ یعنی بلاشبہ، یقیناً لازماً میں تم سے قریب ہوں۔ اس طرح شدّتِ کلام کے ذریعہ اپنے قرب کو جتا کر عنایت مزید فرمائی۔

۵ ـــــ قریب کو بحالت صفت بیان فرمایا بطور فعل نہیں (یوں نہیں فرمایا کہ میں قریب ہو جاتا ہوں۔ بلکہ فرمایا کہ میں تم سے قریب ہی ہوں) اس طرح نہایت قرب کا پتہ دے کر اس کو دوام کا رنگ دے دیا کہ یہ قرب ہمہ وقتی، دائمی غیر منقطع صفت ہے۔

۶ ـــــ اجابتِ دعا کو مضارع کے صیغہ میں فرمایا، ماضی کے صیغہ سے نہیں۔ تاکہ معلوم ہو کہ یہ قبولیت ہمہ وقتی دائمی استمراری ہے جو اس وقت بھی ہو سکتی ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ باقی رہے گی۔

۷ ـــــ وعدہ قبولیت کے حسین مژدہ کو "اِذَا دَعَانِ" "جب کوئی دعا مانگے" کی شرط سے مقید فرما کر معین سوال کی مقبولیت کی ضمانت دی۔

یہ ساتوں نکات اللہ تعالیٰ کی جانب سے قبولیت دعا اور اس کی عنایات مزید کے مظہر ہیں۔

اس کے علاوہ اس آیت کریمہ میں اختصار کے باوجود سات مرتبہ ضمیر متکلم استعمال فرمائی۔ یہ اسلوب کسی اور جگہ نہیں ملتا گویا بار بار اپنے تعلق کو

جتایا جو دعا کی سب سے بڑی حقیقت ہے) لفظِ دعا اور دعوت کا تو تقاضا ہی یہ ہے کہ مانگی ہوئی چیز کے بارے میں سوال کرنے والے کی طرف خصوصی توجہ کی جائے' اور پھر لفظِ سوال "فائدہ کے حصول" کا پتہ دیتا ہے تاکہ سائل کی ضرورت بر آئے۔ اس لئے کہ سوال ہی دعا کا ہدف ہے اور یہی تمام مفاہیم کا جامع ہے۔ مثلاً ضرورت کے وقت سوال جہالت کے وقت سوال' جسمانی یا روحانی ضرورت کا سوال وغیرہ۔

لفظ عبودیت یا عبادی "میرے بندے" مملوکیت کے معنی دیتا ہے۔ اور عبد سے مراد انسان اور ہر صاحبِ شعور ہے جس کی ملکیت کی نسبت اللہ کی طرف دی جائے۔ (چنانچہ کسی جانور کو اپنے مالک کا عبد نہیں کہا جاتا)

اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور دوسروں کی ملکیت میں اصلی اور ادعائی' حقیقی اور مجازی کا فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ علی الاطلاق مالکِ حقیقی ہے اور اس کی ملکیت تمام جہات کو محیط ہے۔ جب کہ دوسرے نہ تو اپنی جانوں کے ہی حقیقی مالک ہیں اور نہ اپنے ہی دیگر صفات وافعال کے حقیقی مالک ہیں (اگر وہ حقیقی مالک ہوتے تو ان صفات کا ان سے چھن جانا ممکن نہ ہوتا) بندے کی طرف کسی چیز کی ملکیت کی نسبت کبھی طبعی ہوتی ہے جیسے اس کی جان' بدن' سماعت' بصارت اور کبھی اعتباری ہوتی ہے جیسے اس کا گھرانہ' مال' مرتبہ وغیرہ اور یہ سب کی سب اللہ کی اجازت' عطا اور بخشش کی مرہونِ ہیں۔ کہ اسی قادر مطلق نے ان چیزوں کو اس بندے سے نسبت دی ہے۔ ورنہ خود بندے کا وجود تک اللہ کا مرہونِ منت ہے۔

چنانچہ فرمایا۔

"اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں کان' آنکھیں اور دل دیئے۔"

(ملک ۲۳)

اور اس نے تمام اشیاء کو پیدا کیا۔

"اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر ان کا الگ الگ انداز رکھا۔" ۲۵:۲

(الفرقان ۲)

نیز یہ کہ اللہ علی الاطلاق ہر شئے سے قریب تر ہے اور اس کے تمام متعلقات پر مکمل طور پر حاوی ہے۔ ارشاد فرمایا۔

"اور ہم تم سے بھی زیادہ قریب اس شخص کے ہوتے ہیں۔ البتہ
۵۶:۸۵ تم نہیں سمجھتے ہو۔" ؟

(واقعہ ۸۵)

"اور ہم تو اس کی رگ گردن سے بھی بڑھ کر اس کے قریب ہیں۔"
۵۰-۱۶

(ق ۱۶)

"جانے رہو کہ اللہ آڑ بن جاتا ہے انسان اور اس کے قلب کے ۸:۲۴
درمیان۔"

(انفال ۲۴)

قلب سے مراد انسانی روح اور اس کا نفس بحیثیت مجموعی ہوتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ بندوں کے مقابلے میں اللہ کی ملکیت حقیقی اور دائمی ہے۔ عباد کا عباد ہونا ہی یہ بتاتا ہے کہ وہ خود کسی چیز کے حقیقی مالک نہیں۔ دوسری طرف اللہ کا اپنے بندوں پر متصرف اعلیٰ اطلاق ہونے کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ ذات اپنے بندوں کی ہر تمنا اور ضرورت کو پورا کرے، انھیں اپنی عطاؤں سے نوازے اپنے فضل سے عطا فرمائے، اپنے تصرف سے ان کی حاجتیں بر لائے۔ یہی اس کی ملکیت، غلبہ اور قدرت کا عین تقاضہ ہے۔ کیوں کہ اس کی ملکیت غلبہ اور قدرت ہر چیز پر محیط ہے۔

نامعقول

اس بارے میں یہودیوں کا یہ قول نہایت بیہودہ ہے "اللہ تعالےٰ نے جب مخلوق کو پیدا فرمالیا اور ان کی تقادیر فرمادیں۔ بس پھر اس کا کام مکمل ہو گیا۔ نئے تصرفات کا اب کوئی اختیار اس کے ہاتھ میں نہ رہا۔ بس جو اس نے لکھ دیا وہ لکھ دیا۔"

اب ازل سے مرقومہ قضا جاری و ساری رہے گی۔ اب اس میں کوئی تبدیلی ترمیم نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی دعا اس سلسلے میں قبول ہو گی۔ کیوں کہ یہ تمام امور اللہ کے دستِ قدرت سے باہر ہیں۔"

اس طرح اس اُمّت (مسلمہ) کے قدریہ لوگوں کا قول بھی بیہودہ ہے۔ مہمل
ان کو رسول اللہؐ نے اپنی اُمّت کا مجوس قرار دیا۔ جو یہ کہتے ہیں کہ
"اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے اعمال میں اب کوئی عمل دخل باقی نہ رہا۔"

قبولیتِ دُعا کی شرط

یہاں ایک نکتہ غور طلب ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اجابت دُعا کے وعدہ کو "اذا دعان" "جب وہ مانگے" سے مقید اور مشروط فرمایا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی دُعا حقیقتاً اور واقعتاً دُعا ہو۔ (اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہو اور اللہ سے مانگی گئی ہو) جس طرح کہ ہم کہیں کہ جب ناصح نصیحت کرے تو اس کی بات دھیان سے سنو یا جب عالم واقعتاً صاحب علم ہو تو اس کی عزت و تکریم کرو۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ ناصح کی ایسی نصیحت گوشِ دل سے سنو جو واقعتاً خیر خواہی پر مبنی ہو اور حقیقی ہو۔ اور اس عالم کی عزت کرو جو حقیقت میں علم کا شناور ہو اور اپنے یقینی علم پر عمل پیرا ہو یعنی اس کا علم حقیقی ہو۔ ظن و تخمین یا وہم و گمان نہ ہو جو عمل میں ترجمہ بھی نہ ہو سکا ہو۔

"اذا دعان" جب واقعتاً مانگے۔ اس کی دعا اس کی فطرت کی اور قلب کی گہرائیوں کی پکار ہو، دل و زبان ہم حال ہوں، زبان دل کی ترجمان ہو صرف زبان کے الفاظ ——— نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے تمام حوائجِ انسانی کو جس کی زبان نے درخواست بھی نہ کی ہو سوال کا نام دیتا ہو جو اس کی فطرت کی پکار ہے۔

فرمایا۔

"اور تم کو ہر چیز دی جو کچھ کہ تم نے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ان کو شمار بھی نہ کر پاؤ بے شک انسان بڑا نا انصاف بڑا ہی ناشکرا ہے۔"

(ابراہیم ۳۴)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ انسان زبان سے سوال کردہ نعمتوں کے علاوہ بھی بے شمار نعمتوں کا سائل ہے۔ یہ سوال وہ زبان سے تو نہیں کرتا بلکہ اپنے فقر، احتیاج اور استحقاق کی فطری زبان سے کرتا ہے جسے اللہ ہی جانتا ہے اور پورا کرتا ہے۔

نیز یہاں تک فرمایا۔

" اس سے سب آسمانوں اور زمین کے رہنے والے سوال کرتے ہیں اور وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے۔"

(الرحمٰن ۲۹)

غرض فطرت کے تقاضوں پر مبنی ہر سوال یقیناً قبولیت سے سرفراز ہوتا ہے اب اگر کوئی دعا قبولیت سے محروم ہے تو اس کے اسباب دو ہی ہو سکتے ہیں۔

(۱) یا تو وہ حقیقتاً دعا ہی نہ تھی، سائل اپنے طور پر اُسے دُعا سمجھ رہا تھا مثلاً ناممکنات کی دُعا، جو فطرت کے خلاف ہے۔ یا جس کا وہ مستحق نہ تھا۔ گویا یہ ایسی دعا ہے کہ حقیقت حال کے انکشاف پر وہ ہرگز اس کا سوال نہ کرتا۔ جیسے کوئی قریب المرگ مریض کے لیئے شفا کی دعا کرے، جبکہ مریض کا وقت پورا ہوچکا ہے۔ اور اب یہی مصلحتِ الٰہی کا تقاضا ہے اور اب اس مرنے والے کی بھلائی کا تقاضہ بھی یہی ہے ــــ البتہ انبیاءِ کرامؑ جب محسوس کرتے ہیں کہ اس مریض کی بقا مصلحتِ الٰہی کے موافق ہے اور اس میں اس کی بھلائی بھی ہے تو وہ اس کی زندگی کے لیئے دعا کرتے ہیں۔ اور مردے زندہ ہوتے ہیں۔

بندے کو اگر ان تمام حقائق کا علم ہوجائے تو پھر وہ ایسی دعائیں ہی نہ کرے گا۔

۲۔ یا ایسا سوال جس میں سوال تو ہو مگر ذاتِ خداوندی سے نہ ہو جو وحدہٗ لاشریک ہے۔ بلکہ زبان، اللہ سے حاجت برآری کے ساتھ ساتھ اسبابِ دنیوی پر لگی ہو، ان میں دل اٹکا ہو، امیدیں انھیں سے وابستہ ہوں۔ اس حالت میں بھی دُعا دوسری شرط "اِذَا دَعَانِ" کے مطابق نہ ہوگی کیونکہ یہ دُعا خالصتاً اللہ سے نہ ہوئی۔ اللہ صرف وہی دعا سنتا ہے جو خلوصِ قلب و زبان کے ساتھ کی جائے اور اسباب و علل پر نگاہیں نہ لگی ہوں کہ وہ سوال کے شریک بن جائیں۔ ایسے دونوں طرح کے سائل اگرچہ زبان سے دُعا تو کرتے ہیں مگر ان کے دل مخلص نہیں ہوتے۔
اُن کے متعلق خدا فرماتا ہے:

"آپ کہہ دیجئے کہ میرا پروردگار تمہاری ذرا بھی پرواہ نہ کرے گا اگر تم دعا (عبادت) نہ کروگے۔" نہیں کرتا

(فرقان ۔ ۷۷)

نہیں کرنے ۔

سورۂ انعام میں فرمایا :

قل من ینجیکم من ظلمٰت البر والبحر تدعونه تضرعًا وخیفة لئن انجٰنا من هٰذه لنکونن من الشاکرین ○ قل الله ینجیکم منها ومن کل کرب ثم انتم تشرکون ○

عربی عبارت نہ معرفی تو خُفۡیَةً ؟ تُشۡرِکُوۡنَ ○

(انعام ۶۳۔ ۶۴)

"آپ کہئے کہ کون تمہیں نجات دیتا ہے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے، جبکہ تم اسے پکارتے رہتے ہو عاجزی سے اور چپکے چپکے کہ وہ اگر ہمیں ان مصیبتوں سے نجات دیدے تو ہم یقیناً شکر گذاری میں داخل ہو کر رہیں۔ آپ کہہ دیجئے اللہ ہی تمہیں نجات دیتا ہے، ان سے اور ہر غم سے۔ اس کے بعد تم شرک کرنے لگتے ہو"

اس قسم کی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان شدید مصائب میں دل کی گہرائیوں اور تقاضائے فطرت کے مطابق صرف اور صرف اللہ ہی سے سوال کرتا ہے لیکن عیش و آرام کی حالت میں وہ اسباب کو بھی دعا میں شامل کرلیتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ یہ اسباب بھی کام آئے اور ان کے ہی سبب مصائب دور ہوئے

اس طرح اس کی دُعا حقیقت میں اللہ سے تعلق ہی نہیں۔
لیکن پھر جب معاملہ شدت اختیار کر لیتا ہے، اور
ظاہری اسباب اپنی تاثیر کھوتے اور تمام خیالی شریک و
سہیم منہ موڑتے دکھائی دیتے ہیں تو اُسے معلوم ہو جاتا
ہے کہ حاجت بر آری کرنے والا اور سوال کو شرف
اجابت بخشنے والا سوائے خدا کے کوئی نہیں۔

ع ۔ جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

تو اب وہ توحید فطری کی جانب لوٹ آتا ہے اور تمام اسباب ظاہری کو فراموش کر دیتا ہے اپنے کریم رب کی طرف متوجہ ہوتا ہے — مگر پھر جب معاملے کی شدت ختم ہو جاتی ہے، اس کی حاجت پوری کر دی جاتی ہے اور آرام و سکون اس پر سایہ فگن ہو جاتا ہے تو پھر وہ دوبارہ انھیں اسباب کی جانب التفات کرتا ہے اور انھیں کو حاجت روا جان کر حسبِ سابق

شرک و نسیان کی گہری کھائیوں میں اتر جاتا ہے۔

دُعا کی اہمیت اور طریقہ

دعا کے سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے:

"اور تمہارے پروردگار نے کہا کہ مجھے پکارو
میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ میری
عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں
ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔" (قرآن)

یہ آیت کریمہ دعا کی دعوت دیتی ہے اور اجابت کا مژدہ سناتی ہے نیز اس آیت میں دعا کو مطلق عبادت کہا گیا ہے اور عبادت کو مطلق دعا

قرار دیا ہے۔ اس کے ترک پر آگ کی وعید بیان فرمائی ہے۔ سزا کی وعید
ہمیشہ مکمل عبادت کے ترک پر آتی ہے اس کے بعض اقسام پر نہیں۔
اس سے معلوم ہوا کہ دُعا اصل عبادت سے نہایت گہرا تعلق
رکھتی ہے۔

دُعا کا طریقہ بتاتے ہوئے فرمایا:

"تم لوگ اللہ کو پکارو اس سے خالص اعتقاد رکھ کر" (مومن ۶۴)
(یہاں خالص اور لاشریک اعتقاد کو شرط قرار دیا)

"اور اللہ کو پکارتے رہو ڈر اور آرزو کے ساتھ
بیشک اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے بہت نزدیک ہے"۔

لایحب

(دعا کو خوف اور طمع کے ساتھ مشروط کر کے نیکوکاری کی ترغیب دی)
(اعراف ۵۶)

"ہم کو پکارتے رہتے تھے شوق اور خوف کے ساتھ
اور ہمارے سامنے دب کر رہتے تھے۔ (الانبیا ۹۰)
(یہاں دب کر رہنے والوں کو دعاؤں کی قبولیت کا مژدہ سُنایا)۔

"اپنے پروردگار سے دعا کرو عاجزی کے ساتھ
اور چپکے چپکے۔ بے شک وہ حد سے نکلنے والوں کو
پسند نہیں کرتا" (اعراف ۵۴)
(یہاں حد سے نکلنے والے گناہوں کو قبولیت دعا کی رکاوٹ بتایا)

"اللہ ان لوگوں کی دعا اور عبادت کو قبول
کرتا ہے جو ایمان لائے، نیک عمل کیے اور ان کو
اپنے فضل سے اور بڑھاتا رہتا ہے" (شوریٰ ۲۶)

(اس آیت میں ایمان اور عمل کو قبولیت دعا کا طریقہ قرار دیا)

غرض ان آیات میں دُعا کے ارکان، سائل کے آداب دُعا میں اخلاص، اللہ کے سوا ماسوا تمام اسباب سے امیدوں کا منقطع کرنا، خوف وامید، رغبت وڈر، خشوع وخضوع، الحاح وزاری، اصرار، ذکر، ایماء، عمل صالح، ادب حضوری وغیرہ کو دعا کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

لہذا بندوں کو چاہیے کہ اس کی دعوت پر لبیک کہیں۔ اسی کی جانب متوجہ ہوں، اسی پر بھروسہ کریں، اُس کی باتوں پر ایمان لائیں، اور اس کی اس بات غیر متزلزل یقین رکھیں کہ وہ ہم سے نہایت قریب ہے، دُعائیں سنتا اور قبول کرتا ہے اور سب کچھ اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ تاکہ وہ دعا میں راہ یاب ہوں۔

روایات پر بحث

شیعہ سنی دونوں فریقوں کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:
"دُعا مومن کا ہتھیار ہے"
کتاب عدۃ الداعی میں حدیثِ قدسی ہے، اللہ نے فرمایا:
"اپنی ہر ہر حاجت یہاں تک کہ اپنی بکری کا چارہ اور اپنے گندھے ہوئے آٹے کے لیے نمک تک کا مجھ ہی سے سوال کرو"
المکارم میں حضورؐ سے مروی ہے کہ:
"دُعا قرآن کی قرأت سے افضل ہے"۔
اس لئے کہ اللہ کا ارشاد ہے:
"آپؐ کہہ دیجیے کہ میرا پروردگار تمہاری کچھ پرواہ نہ کرے گا اگر تم دُعا نہ کرو گے!"
(معلوم ہوا کہ خداوند عالم کی توجّہات کے حصول کا بہترین طریقہ اس سے دُعا کرنا ہے)۔ مترجم
حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے بھی یہی روایت منقول ہے۔
عدۃ الداعی میں بطریق محمد بن عجلان، نبی کریمؐ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک پیغمبر کی جانب وحی فرمائی:
مجھے اپنے عزت و جلال کی قسم! میں اپنے غیر سے اُمیدیں باندھنے

والے آرزومند کی آرزوؤں کو نا امیدی سے بدل دیتا ہوں اُسے لوگوں کے درمیان ذلت کا لباس پہناتا ہوں۔ اُسے اپنے فضل و کرم سے دُور کر دیتا ہوں۔ کیونکہ وہ میرا بندہ ہو کر مصائب و شدائد میں دوسروں سے مدد مانگتا ہے۔ حالانکہ تمام مشکلات کا حل تو صرف میرے دستِ قدرت میں ہے۔ جبکہ وہ مجھے چھوڑ کر دوسروں سے امیدیں باندھتا ہے۔ میں ہی بالذات غنی اور جوادِ علی الاطلاق ہوں۔ بند دروازوں کی چابیاں صرف میرے دستِ قدرت میں ہیں اور میرا دروازہ ہر سائل کے لئے کھلا ہے۔ الخ

عدۃ الداعی میں نبیؐ کریمؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"میری مخلوق میں جو شخص میرے سوا (مجھے چھوڑ کر) میری مخلوق کا دامن تھامتا ہے، میں اس پہ زمین و آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہوں۔ پھر وہ مجھ سے کتنا ہی مانگے، میں اُسے عطا نہیں کرتا، اور اگر دعا کرتا ہے تو قبول نہیں کرتا۔ اور اس کے برعکس میری مخلوق میں سے جو بھی میری مخلوق کو چھوڑ کر میری رحمت کا دامن تھامتا ہے تو میں آسمان اور زمین کو اس کے رزق کا ضامن بناتا ہوں۔ پھر اگر وہ مجھ سے دعا مانگتا ہے تو میں قبول کرتا ہوں۔ اگر مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں عطا کرتا ہوں اور اگر مجھ سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتا ہے تو میں اس کے گناہ معاف کر دیتا ہوں۔"

یہ دونوں احادیث دُعا میں اخلاص کی ضرورت کی خبر

دیتی ہیں۔ لیکن ان روایات سے اسباب دنیا کو استعمال کرنے کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ خود اللہ نے اشیاء کو احتیاجات و ضروریات کے پورا کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ البتہ اسباب و آلات بذات خود مستقل علت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کے سبب، وہ اسباب و ضروریات کو پورا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔"

انسان خود اپنے شعورِ باطنی اور فطرت کے تقاضوں سے جانتا ہے کہ ہر ہر حاجت کا کوئی پورا کرنے والا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اسبابِ ظاہری کبھی کبھی اپنی تاثیر کھو بیٹھتے ہیں کیونکہ سبب تام کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ اپنی تاثیر میں اللہ کی اجازت کے محتاج ہیں۔ اسی کی طرف تمام حوائج پلٹتی ہیں اور اپنے پورا ہونے میں اللہ کی محتاج ہیں۔ کیونکہ اللہ کی ذات ہی ہر امر کا مبداء اور ہر امر میں معتمد علیہ ہے اسی امر کو سمجھانے کے لئے وہ ان ظاہری اسباب کو معتمد علیہ (بھروسہ کے قابل) نہیں بناتا۔ تاکہ ان کا سببِ حقیقی سے تعلق منقطع نہ ہو اور یہ بات ہمہ وقت یاد رکھے کہ ان ظاہری اسباب کے علاوہ ضرور کوئی ذات ہے، جو حقیقت میں معتمد ہے اور قاضی الحاجات ہے۔

انسان معمولی سی توجہ سے اس بڑی حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے (کیونکہ بارہا وہ اسباب کی تاثیر کو کالعدم ہوتے دیکھ چکا ہوتا ہے)۔ اسی لئے جب وہ سوال کرتا ہے یا اپنی حاجت طلب کرتا ہے تو اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ احساس بہرحال موجود رہتا کہ وہ اپنے پروردگار سے مانگ رہا ہے۔ اسی شعورِ باطنی ہی کے سبب اس کی حاجات اسباب کے حوالے سے پروردگار کی بارگاہ سے پوری ہو جاتی ہیں۔

لیکن جب وہ کسی ظاہری سبب پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے حوالے سے اپنی چاہت طلب کرتا ہے تو حقیقت میں وہ ظاہر پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ کام اس کی فطرت کے ظاہری شعور کا نہیں ہوتا بلکہ اس کا غلط اور سطحی تخیل اسے یہ صورت دکھاتا ہے۔ اس طرح اس کے ظاہر اور باطن میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے اور اختلاف اور تضاد مل کر دعا کی تاثیر کو ضائع کر دیتے ہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ انسان بسا اوقات ایسی چیزوں کی تمنا اور جستجو کرتا ہے جو آخر کار اس کے لئے ضرر رساں ثابت ہوتی ہیں اور اس سے زیادہ منفعت بخش چیز کوئی اور ہوتی ہے لیکن وہ دوسری چیز کو چھوڑ کر پہلی چیز کو اپنا لیتا ہے۔ اسی طرح وہ بسا اوقات کسی چیز سے دور بھاگتا ہے لیکن اچانک اس چیز کی خوبیاں اور فائدے اس پر عیاں ہو جاتے ہیں تو پھر وہ پہلی کم نفع بخش چیز کو چھوڑ کر اس دوسری چیز کو اپنا لیتا ہے جو پہلے اس کی نظر میں مضر تھی۔ جیسے بیمار بچہ صحت کی تمنا رکھتے ہوئے کڑوی دوا سے کتراتا ہے اور رونا دھونا شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ اپنے شعور باطنی سے وہ خود صحت کا طلبگار رہتا ہے اور اس طرح حقیقت میں وہ دوا کا طالب ہوتا ہے لیکن زبانی اور عملی طور پر وہ اس کے خلاف کر رہا ہوتا ہے۔

انسان کا بھی اس کی زندگی کے لئے فطری فکر اور شعور باطنی کے مطابق ایک نظام ہے جبکہ دوسرا نظام اس کے اپنے تخیلات پر مبنی ہے۔ فطری نظام سے غلطی یا خطا نہیں ہوتی۔ جبکہ ہمارے تخیلی نظام سے بسا اوقات غلطی اور خطا ہوتی رہتی ہے۔ انسان اکثر اپنے خیالات اور تصورات کے مطابق کسی چیز کا سوال کرتا ہے جبکہ اپنے فطری نظام کے مطابق وہ عین اسکی مخالف

چیز کا سوال کر رہا ہوتا ہے۔ ان احادیث کی یہی مناسب توجیہ ہو سکتی ہے حضرت علیؑ کا ارشاد: "عطا بقدرِ نیت ہے" اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔

عدۃ الداعی میں نبی کریمؐ سے مروی ہے کہ:

"اللہ سے قبولیت کا یقین رکھتے ہوئے مانگو۔"

حدیثِ قدسی میں ہے کہ:

"میں اپنے بندے کے گمان کی جگہ ہوں مجھ سے اچھا ہی گمان رکھو!"

اِن ارشادات کا مطلب یہ ہے کہ نا امیدی، شک اور تردّد درحقیقت سوال نہ کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ یا یہ خود سوال کی نفی ہے اور خلافِ فطرت سوال ناممکن کا سوال ہے جبکہ ناممکنات کی دعا کی ممانعت ہے۔"

عدۃ الداعی میں نبی کریمؐ سے مروی ہے:

" اپنی حاجات کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جزع و فزع کرو، اپنی مشکلات میں اسی کی پناہ چاہو۔ اسی کی بارگاہ میں عاجزی کرو اس کو پکارو کیونکہ دعا عبادت کا مغز ہے۔ مومن جو کچھ بھی اللہ سے طلب کرتا ہے، بہرحال اس کی طلب پوری کر دی جاتی ہے اُسے یا تو دنیا ہی میں وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے یا آخرت میں مؤخر کر دی جاتی ہے جس قدر یہ تاخیر ہوتی ہے اسی قدر اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔"

نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ کی اپنے فرزند امام حسنؑ کو وصیت ہے:

" پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانوں کی چابیاں تیرے ہاتھ میں دیدیں۔ کیونکہ اس نے تجھے ہر چیز مانگنے کی اجازت دیدی

اب تو جب چاہے دعا مانگ کر اللہ کی نعمتوں کے دروازے کو کھول سکتا ہے اور اس کی بارانِ رحمت سے مستفید ہو سکتا ہے۔ لیکن قبولیت میں تاخیر تجھے ناامید نہ کرے کہ عطا بقدرِ نیت ہوتی ہے۔ بسا اوقات قبولیت میں تاخیر ہوگی تاکہ سائل کے لیئے عظیم اَجر کا سبب بنے، اور اس کی زیادہ عطاؤں کا مستحق قرار پائے۔"

(اسی لیئے امامؑ نے انتظار فرج اور قبولیت کی آرزو کو بہتر عبادت اور سببِ قربِ الٰہی فرمایا ہے)۔ مترجم

حضرت علیؑ نے فرمایا:

"اور بسا اوقات تم اللہ سے سوال کرو گے، مگر مطلوبہ چیز نہ پاؤ گے۔ اور پھر بہت جلد یا بدیر اس سے کہیں بہتر چیز تمہیں عطا ہوگی یا اس کے سبب کوئی تکلیف تم سے ہٹا لی جائے گی۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ اگر تمہارے سوال پر دیدی جائیں تو وہ تمہارے دین اور عاقبت کی تباہی کا سامان ہو جاتی ہیں۔ اس لیئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ایسی چیز مانگو، جس کی بہتری برقرار رہے اور وبال ختم ہو۔ رہا مال تو وہ تمہارے پاس باقی ہی نہ رہے گا اور نہ ہی تم اس کے لیئے باقی رہو گے۔"

آپؑ ہی کا ارشاد ہے: "عطا بقدرِ نیت ہوتی ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجابتِ دعا مطابق ہوتی ہے۔ سائل جس قدر قلب کی گہرائیوں سے مانگتا ہے اسی قدر

اسے عطا ہوتی ہے۔ اس کی دعا کے الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا، کبھی الفاظ معانی اور مفاہیم کا ساتھ نہیں دیتے!!

اجابت دعا کے بارے میں اس سے جامع تر اور حسین تر کوئی کلمہ نہیں۔ کیونکہ آپؑ نے اجابت دعا کے اصول کو نہایت مختصر عبارت میں بیان فرمایا ہے جس میں وہ تمام اسباب آجاتے ہیں جو دعا کی عدم اجابت کا سبب بنتے ہیں۔ مثلاً قبولیت کا دیر سے ظاہر ہونا، دنیا میں مسئولہ چیز سے بہتر چیز ملنا، یا آخرت میں اس سے بہتر ملنا۔ یا سائل کے مناسبِ چیز کا مل جانا وغیرہ۔ سائل اکثر کسی خوشگوار چیز کا سوال کرتا ہے حالانکہ اس کی فوری عطا خود اس کے حق میں خوشگوار نہیں ہوتی۔ اس کی عطا میں تاخیر کر دی جاتی ہے تاکہ سائل کی تشنگی بڑھے اور مسئولہ چیز اس کے لئے زیادہ خوشگوار ہو جائے۔ گویا حقیقتاً اس کی خوشگواری کا سوال خود اس کی تاخیرِ عطا کا سوال بن جاتا ہے۔

اسی طرح امورِ دینی میں اہتمام کرنے والا مومن اگر عدم علم کے باعث ایسی چیز کا سوال کرے جس میں اس کے دین کی تباہی مضمر ہو۔ جبکہ وہ اسے اپنی سعادت سمجھ رہا ہو۔ حالانکہ اس کی سعادت درحقیقت یہ نہ ہو جبکہ اس نے حقیقتاً تو سعادت ہی کا سوال کیا تھا اس لئے اس کی یہ دعا دنیا میں نہیں آخرت میں شرفِ قبولیت پائے گی۔

عدۃ الداعی میں حضرت امام محمد باقرؑ سے مروی ہے:

"بندہ کبھی بھی اپنے پروردگار کی طرف ہاتھ نہیں پھیلاتا، مگر اللہ اسے خالی لوٹانے سے حیا فرماتا ہے وہ اپنے فضل و رحمت سے جو چاہتا ہے اُسے عطا فرما دیتا ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کوئی دعا مانگے تو اپنا ہاتھ نہ لوٹائے

تا آنکہ اپنے سر اور چہرے پر مل لے ۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ
" اپنے چہرے اور سینے پر مل لے "

مولف کہتے ہیں در منثور میں اسی کے ہم معنی متعدد صحابہ مثلاً حضرت سلمان، جابر، عبد اللہ بن ، انس بن مالک اور ابنِ ابی مغیث کے طریق سے، نبی کریمؐ سے آٹھ روایات مذکور ہیں ۔ ان تمام روایات میں ہاتھ کا اٹھانا بھی مذکور ہے ـــــ بعض لوگوں نے یہ کہہ کر ہاتھ اٹھانے سے انکار کیا ہے کہ اس سے ذاتِ باری تعالیٰ کی تجسیم اور جہت ثابت ہوتی ہے کیونکہ ہاتھوں کا آسمان کی جانب اٹھانا اس بات کی دلیل ہے کہ خدا آسمانوں میں ہے حالانکہ وہ جہت یا مکان سے منزہ ہے ۔ لیکن یہ قول فاسد ہے کیونکہ تمام عباداتِ بدنیہ کی حقیقت، قلبی توجہ کو ایک مقام پر مرکوز کرنا ہے اور بلند ترین حقائق کو خیال کے قالب میں اتارنا ہے جیسا کہ نماز، روزہ، حج وغیرہ کے اجزاء اور شرائط سے مترشح ہوتا ہے ۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو عباداتِ بدنیہ کی بات ہی نہ بنتی ۔ اسی طرح دعا بھی توجہ قلبی اور طلب باطنی کی ایک ظاہری شکل ہے اور یہ عادتِ جاریہ ہے کہ فقیر مسکین کسی غنی سے ہمیشہ ہاتھ اٹھا کر اور ہاتھ پھیلا کر سوال کرتا ہے اور یہ اظہار ہے اس کی عاجزی اور ذلت کا ۔ جو اس کی قلبی اور باطنی حقیقت ہے ۔

شیخ نے اپنی مجالس میں اور عدۃ الداعی میں مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہؐ " جب دعا فرماتے تو اپنے ہاتھ اس طرح بلند کرتے جیسے کھانے کا طلبگار مسکین کھانا مانگتا ہے "

بحار الانوار میں حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے ایک شخص کو

یہ کہتے سنا "اے اللہ! میں فتنہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔ یہ سن کر آپؑ نے فرمایا: "تم تو اپنے مال اور اولاد سے پناہ مانگ رہے ہو، اس لئے کہ ارشادِ باری ہے اِنما اموالکم و اولادکم فتنۃ "تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو بس آزمائش کی چیزیں ہیں، تم کہو، میں تمام فتنوں کی گمراہیوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

عدۃ الداعی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے:

"اللہ تعالیٰ بھولنے والے بے پرواہ دل کی دُعا قبول نہیں فرماتا"

عدۃ الداعی ہی کی ایک اور روایت میں حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ

"اللہ تعالیٰ لہو و لعب میں مشغول دل کی دُعا قبول نہیں فرماتا"

ان روایات کے ہم معنی اور روایات بھی ہیں۔ اس میں رمز یہ ہے کہ سہو اور لہو و لعب میں دُعا اور سوال کی حقیقت ہی متحقق نہیں ہوتی۔

دعوات الراوندی میں ہے کہ توارت میں مرقوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے فرماتا ہے: "تو ہمیشہ میرے بندوں میں سے کسی کے خلاف دُعا کرتا رہتا ہے کہ اس نے تجھ پر ظلم کیا ہے ــــ یا جبکہ میرے ایسے بندے بھی ہیں جو تیرے لئے بد دعا کرتے ہیں کہ تونے ان پر ظلم کیا ہے اگر تو چاہے تو میں تیری ان کے بارے میں اور اُن کی تیرے بارے میں دُعا قبول کرلوں؟ اور اگر تو چاہے تو میں اسے قیامت تک مؤخر کردوں۔"

مؤلف کہتے ہیں کہ اس میں یہ راز پنہاں ہے کہ جو شخص کسی چیز کا سوال

کرتا ہے وہ حقیقت میں اُس بات پر راضی ہوتا ہے اور اس طرح
اس کی یہ رضامندی ان تمام لوگوں کے لئے بھی ہوتی ہے جو ایسی صورتحال
سے دوچار ہوں ۔ اس لئے جب وہ کسی ظالم سے انتقام کی دعا مانگتا ہے
تو گویا وہ حقیقت میں ظالم سے انتقام پر راضی ہے ۔ اس معاملے میں چونکہ
وہ خود بھی ظالم ہے لہٰذا حقیقتاً اپنے ہی خلاف دُعا کر رہا ہے جبکہ وہ
کبھی ہرگز اپنے لئے اس سزا پر راضی نہ ہوگا جس کے لئے وہ دوسروں کے
لئے راضی ہے ۔ گویا اس طرح ایسی دُعائیں کالعدم ہوتی ہیں اور اُن کا حقیقی
صدور ہی نہیں ہوتا ۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

"اور انسان تو برائی کی درخواست بھی اس تقاضے سے کرتا ہے
کرتا ہے جس طرح بھلائی کی درخواست اور انسان ہے ہی جلد باز۔"
(الاسرا — ۱۱)

عدۃ الداعی میں ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت ابو ذرؓ سے فرمایا :

"کیا میں تمہیں ایسے کلمات نہ سکھاؤں جس کی بدولت
اللہ تمہیں فائدہ عنایت فرمائے؟ عرض کی کہ ہاں یا رسول اللہؐ
آپؐ نے فرمایا : "اللہ کے حقوق کی نگہبانی کر اللہ تعالیٰ تیری
حفاظت فرمائے گا ۔ اللہ پر نظر رکھ اسے اپنے ساتھ پائے گا ، فراخ
دستی میں اسے یاد رکھ وہ تجھے تکلیف میں یاد فرمائیگا ، جب سوال کر
اللہ ہی سے کر ، جب بھی مدد مانگ اللہ ہی سے مانگ ۔"

مؤلف فرماتے ہیں " فراخ دستی میں یاد کرنے کا مطلب ہے کہ جب
اللہ تعالیٰ نے تجھے فراخدستی اور آرام دیا ہو تو اس وقت خدا سے دُعا
کرتا رہ ، اور اسے مت بھول تاکہ وہ مصائب اور تنگی میں تیری دُعا

قبول فرمائے اور اس کی رحمت تجھے نہ بھلائے۔ جو شخص حالتِ فراخی میں اپنے پروردگار کو بھول گیا گویا وہ اسبابِ ظاہری کا مطیع و منقاد ہوا اور مصائب میں اپنے رب کی بارگاہ میں اطاعت کا مظاہرہ کر کے اس نے یہ ثابت کیا کہ وہ مصائب و آلام میں بھی رب کی ربوبیت کا قائل ہے حالانکہ یہ اپنے مقام پر ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ربِ تعالیٰ تو ہر حال میں رب ہے یہ تو صرف اس کی فراخیٔ حالات تھی جس کے سبب اس نے اپنے رب کو بھلا دیا تھا

یہی مضمون بعض اور روایات سے بھی ماخوذ ہے چنانچہ مکارم الاخلاق میں حضرتِ امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"جس نے قبل از نزولِ بلا دعا فیت کی دعا کی ہوتی ہے۔ وہ دعا نزولِ مصائب کے وقت قبول ہو جاتی ہے۔"

بعض عرفا نے کہا ہے کہ "دعا ایسی آواز ہے جو آسمانوں میں رد نہیں کی جاتی جس نے مصائب سے قبل دعا نہیں مانگی ہوتی، مصائب کے نزول کے وقت اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ اس کی دعا پر فرشتے کہتے ہیں۔ "یہ بھلا کس کی آواز ہے؟ اس آواز کو تو ہم پہچانتے ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی مویّد ہے کہ فرمایا:

"انھوں نے اللہ کو بھلا دیا سو اُس نے انھیں بھلا دیا" (توبہ) ۶۷

اِنَّ الدُّعاءَ لا یُرَدُّ مع الانقطاع "دُعاء رَد نہیں ہوتی جو انقطاع کے ساتھ کی جائے" کے منافی نہیں۔

کیونکہ مطلق مصائب اسبابِ ظاہری سے مکمل انقطاع کا باعث نہیں ہوتے۔ اس لئے ارشادِ گرامی ہے۔ "جب بھی سوال کرو اللہ سے

سوال کرو۔ اور جب بھی مدد مانگو اللہ ہی سے مدد مانگو۔

اس حدیث میں اس نکتہ کو واضح کیا گیا ہے کہ سوال اور استمداد کا تعلق حقیقتاً صرف باری تعالیٰ ہی سے ہے۔ رہے دُنیا کے اسباب جو عادۃ ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں ان کی سببیت اس حد تک ہے جس حد تک اللہ نے ان کو محدود فرما دیا ہے اس لئے یہ حقیقی اثر نہیں رکھتے۔ صرف مقصود تک رسائی کا وسیلا اور طریقہ ہیں۔ حقیقی قدرت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے چنانچہ بندہ پر لازم ہے کہ اپنی حاجات کے لئے بارگاہِ کبریا میں سوالی ہو، اور کسی ظاہری سبب پر اعتماد نہ کرے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ خداوندِ عالم اسباب کے ذریعے سے بندوں کی حاجتیں پوری فرماتا ہے۔ اس لئے اس ارشادِ رسول میں مسبب الاسباب خدا پر اعتماد کی دعوت دی گئی ہے اس لئے کہ وہی اسباب میں تاثیر اور طاقت ودلیعت فرماتا ہے۔ اس لئے اسباب پر اعتماد کرنا بے فیض، خود محتاج اشیاء سے فیض کی طلب ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حوائج اگرچہ اسباب ہی کے محتاج ہیں مگر اس کی حیثیت وہی ہے جو زبان کی ہے جو دل کے لئے صرف وسیلۂ اظہار ہے یا جسم کی حیثیت ہے جو انسان کی صرف ظاہری شکل ہے لیکن حقیقی سبب صرف وہی ذاتِ باری ہے۔ اس لئے اسباب سے کام لیتے ہوئے نگاہ صرف اُسی ذات مسبب الاسباب پر ہو، خود اسباب پر نگاہِ طلب نہ اُٹھے۔ نہ ان سے کوئی توقعات باندھی جائیں۔

انسان ہی کو دیکھیں کہ وہ ہر ہر کام میں اسباب کا محتاج ہے۔ وہ اپنے تمام افعال کے انجام دینے میں اپنے بدن کے اعضا و ارکان کا محتاج ہے اس کو عطا کے لئے ہاتھ، دیکھنے کے لئے آنکھ اور سماعت کیلئے کان کی احتیاج ہے۔

اب اگر کوئی اسباب سے قطع نظر کر کے خدا سے مانگتا ہے تو گویا وہ بغیر آنکھ کے دیکھنا، بغیر ہاتھ کے دینا، اور بغیر کان کے سُننا چاہتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے سوا اسباب پر ہی اعتماد کر رہا ہے تو گویا وہ صرف ہاتھ، آنکھ اور کان کی طرف متوجہ ہے اور اس شخص سے غافل ہے جس کے ہاتھ، آنکھ اور کان سے یہ تمام امور سرزد ہو رہے ہیں۔

البتہ یہ واضح رہنا بہت ضروری ہے کہ امور کا اسباب سے منسلک ہونا اللہ کی غیر متناہی قدرت کاملہ کو مقید نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے اختیارات کو سلب کرتا ہے۔ جیسا کہ انسان کی سابقہ مثال سے واضح ہو جاتا ہے کہ انسان لینے، دیکھنے دینے اور سُننے پر قادر ہے لیکن اس کے یہ افعال ہاتھ، آنکھ اور کان کے محتاج ہیں (گویا فعل اپنے صدور کے لیے سبب کا محتاج ہے)۔ مگر اللہ کی ذات قادر علی الاطلاق ہے۔ البتہ افعال اپنی خصوصیات کی بدولت بعض اسباب کے محتاج ہیں۔ مثلاً زید (کوئی بھی انسان) کا وجود اللہ کا فعل ہے لیکن اپنے وجود میں آنے کے لیئے وہ ماں، باپ، مقام اور دیگر شرائط کا محتاج ہے۔ جس کے بغیر اس کا وجود میں آنا ہی ممکن نہیں اس سے واضح ہوا کہ یہ فعل ہوتا ہے جو اسباب پر موقوف ہوتا ہے، فاعل موقوف نہیں ہوتا۔

حضورؐ کا یہ ارشاد ہے کہ:

"تقدیر کا قلم قیامت تک انجام پانے والے امور کے بارے میں جاری ہو چکا۔" پھر یہ بھی فرمایا کہ "جب بھی مانگو اللہ ہی سے مانگو"

یہ دوسرا جملہ پہلے جملے کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔ اس طرح پہلا جملہ دوسرے جملے کی علت ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ حوادث اللہ کے ہاں مرقوم اور مقدر ہو چکے ہیں

اور ان میں کوئی سبب بھی حقیقی طور پر موثر نہیں ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ اسباب بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لئے اللہ کے غیر سے سوال نہ کرو اور نہ غیر سے مدد مانگو، کہ وہ بے حیثیت ہیں۔ اصل سلطنت، حکم، حکومت، مشیت صرف اللہ ہی کی ہے جو دائمی باقی رہنے والی جاری و ساری ہے۔

دعا کے بارے میں ایک روایت مروی ہے بہت سے راویوں سے ۔۔۔

"دعا بھی تقدیر ہے"

اعتراض کا جواب

یہی حدیث یہودیوں کے دعا پر اس اعتراض کا جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ دعا میں جو سوال کیا جا رہا ہے یا تو اس کا ملنا مقدر میں ہے یا نہیں ہے۔ پہلی صورت میں اس کا ملنا یا ہونا لازم ہے جبکہ دوسری میں ناممکن۔ دونوں صورتوں میں دعا کی تاثیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا مقدر ہونا بھی اس کے وجوب میں لانے والے اسباب سے مستغنی نہیں ہوتا۔ دعا بھی وجود میں لانے کا ایک سبب ہے۔

اسی لئے دعا چونکہ اسباب میں سے ایک سبب ہے جس کے نتیجہ میں اشیاء وجود میں آجاتی ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ "دعا بھی تقدیر سے ہے۔"

بحار میں ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: "قضاء کو دعا ہی لوٹاتی ہے"۔

حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے "دعا حتمی قضا تک کو لوٹا دیتی ہے"

حضرت امام ابو الحسن موسیٰؑ کاظم سے مروی ہے کہ "ہمیشہ دعا مانگتے رہو کہ دعا اور اللہ سے سوال اُن مصائب کو دور کر دیتا ہے جو مقدر

ہیں اُن کی قضا بھی جاری ہوچکی ہے۔ صرف ان کا عملی اجرا باقی ہے ایسی حالت میں بھی اگر بندہ اپنے رب سے دعا کرتا ہے تو اللہ اس کی مصیبت کو رَد کر دیتا ہے۔"

جناب امام صادقؑ سے مروی ہے "دعا حتمی اور مبرم قضا تک کو پھیر دیتی ہے اس لئے خدا سے دعا کرو کہ یہ ہر رحمت کی چابی اور ہر حاجت کی بر آری ہے۔ اللہ کی رحمتوں کے خزانے دعا سے حاصل ہوتے ہیں۔ جب دروازے کو بکثرت کھٹکھٹایا جاتا ہے تو وہ کھٹکھٹانے والے کے لئے کھل ہی جاتے ہیں۔"

اس حدیث میں بار بار دعا کرنے پر اصرار فرمایا ہے۔ اس لئے کہ کثرتِ دُعا اخلاص اور ایمان پر دلالت کرتی ہے۔

اسمٰعیل بن ہمام امام ابوالحسنؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "بندے کی پوشیدہ اور سری دُعا ستر اعلانیہ دعاؤں کے برابر ہے۔"

اس حدیث میں دعاؤں کو خفیہ طور پر کرنے اور چھپانے کا حکم دیا گیا ہے کہ اس سے طلب میں اخلاص پیدا ہوتا ہے۔

المکارم میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے:

"دعا رَد کر دی جاتی ہے جب تک محمدؐ و آل محمدؐ پر درود نہ بھیجا جائے"

آپؑ ہی سے مروی ہے: "جو اپنی حاجت سے قبل چالیس مومنین کے لئے دعا کرتا ہے اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔"

دعا کا طریقۂ کار

حضرت امام صادقؑ سے مروی ہے کہ:

"ایک شخص نے امام ؑ سے پوچھا کہ قرآن مجید میں دو آیات ایسی پاتا ہوں کہ جب ان پر عمل کرتا ہوں تو نتیجہ نہیں پاتا۔

آپ ؑ نے پوچھا کہ وہ کون سی آیات ہیں؟ اس نے کہا "ادعونی فاستجب لکم" (مجھ سے مانگو میں قبول کرونگا)۔ ۶۰ - م

جبکہ ہم دعا مانگتے ہیں مگر قبولیت نہیں دیکھتے۔ آپ ؑ نے فرمایا کیا تمہارے خیال میں اللہ وعدہ خلافی فرماتا ہے؟ میں نے کہا نہیں —— فرمایا: پھر؟ میں نے کہا "یہی مجھے نہیں معلوم" —— آپ نے فرمایا "میں تمہیں بتاتا ہوں، جو اللہ کے فرامین کی اطاعت کرتا ہے اور پھر دُعا کو دُعا کے طریقوں کے مطابق انجام دیتا ہے اس کی دعا قبول ہوتی ہے"

میں نے پوچھا، دعا کا طریقہ کیا ہے؟ آپ ؑ نے فرمایا:

"دعا کی ابتدا اللہ کی حمد، اور عظمت کے ذکر سے کرو۔ اپنے اوپر ہونے والی نعمتوں کی بارش کے تذکرے سے کرو۔ پھر ان نعمتوں کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرو۔ پھر محمد ؐ اور آل محمد ؐ پر درود بھیجو، پھر اپنے گناہوں کو یاد کر کے ان کی بخششیں اور مغفرت طلب کرو۔ اس کے بعد حرف مطلب کی دعا کرو۔"

پھر میں نے دوسری آیت "ما انفقتم من شیئٍ فھو یخلفہ" (جو چیز تم اللہ کے لئے خرچ کروگے اس کا نعم البدل پاؤگے)۔ — جبکہ میں اس کا کوئی نعم البدل یا اجر نہیں پاتا۔

آپ نے فرمایا: "کیا تمہارا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی فرماتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ہرگز نہیں۔" پوچھا۔ پھر؟

میں نے عرض کی "نہیں معلوم"۔ آپؐ نے فرمایا:
"اگر تم میں سے کوئی حلال کی کمائی میں سے خرچ کرتا ہے تو ہر درہم کے بدلے اللہ اسے نعم البدل عطا فرماتا ہے"۔

اِن احادیث میں آدابِ عطا تعین ہوئے۔ یہ آداب بندے کو دعا اور استجابت دعا سے قریب کرتے ہیں۔

الدرّ المنثور میں ابنِ عمر سے روایت ہے رسول اللہؐ نے فرمایا:
"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی دعا کو قبول کرنا چاہتا ہے تو اسے دعا کی اجازت (توفیق) مرحمت فرماتا ہے"۔

ابنِ عمر ہی نبی کریمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ:
"جس کے لئے دعا کا دروازہ کھولا گیا اس کے لئے رحمت کے دروازے کھولے گئے"۔

ایک اور روایت میں ہے: "تم میں سے جس کے لئے دعا کا دروازہ کھولا گیا (یعنی دعا کی توفیق دی گئی) (مترجم) اس کے لئے جنت کے دروازے کھولے گئے"۔

اس قسم کی روایات ائمہ اہلبیتؑ سے بھی مروی ہیں:
"جسے دعا دی گئی، اسے قبولیت دی گئی"۔

الدرّ المنثور ہی میں معاذ بن جبلؓ رسولِ کریمؐ سے روایت فرماتے ہیں کہ:
"اگر تمہیں صحیح معنوں میں معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی تو تمہاری دعاؤں سے پہاڑ ہل جاتے"۔

مؤلف رقمطراز ہیں کہ اس میں یہ راز پنہاں ہے کہ

خدا کے مقامِ ربوبیت، حاکمیت اور سلطنت مطلقہ سے ناواقفیت انسان کو اسباب پر اعتماد کی دعوت دیتی ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ وہ یہ باور کرنے لگتا ہے کہ اسباب بھی حقیقی موثر ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اشیاء کے صدور کو اسباب ظاہری ہی کا نتیجہ گردانتے لگتا ہے یا کم از کم یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ان اسباب کا بڑا مقام ہے۔ حی

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ حرکت (چلنا) مقصد سے قریب کرتا ہے اور سفر منزل سے قریب کرنے کا سبب ہے۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ سفر واسطہ ہے اور اللہ ہی موثر ہے لیکن ساتھ ساتھ سبب (سفر) کی بقا کا اعتقاد بھی برقرار رہتا ہے کہ اگر چلیں گے نہیں تو منزل کا قرب نہ ملے گا۔ بہرحال ہم مسببات کے خلاف نہیں اگرچہ اسباب صرف واسطہ ہوتے ہیں۔ موثر بالذات نہیں ہوتے۔

تاثیر واقعی صرف اللہ مسبب الاسباب سے ہوتی ہے لیکن ہمارا یہ وہم کہ اسباب بھی موثر ہیں، اللہ تعالیٰ کی عظمت، حاکمیت، سلطنت اور قدرت مطلقہ کے منافی ہے۔ یہی وہ وہم ہے جس کے باعث ہم اسباب عادیہ کے بغیر مسببات کے وجود ہی کو محال سمجھتے ہیں۔ سفر ہی سے منزل کا قرب، کھانے ہی سے سیری اور پانی ہی سے سیرابی کو لازمی سمجھتے ہیں۔

معجزات کی بحث میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ناموس علمیہ اور معلولیہ یا دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ اور مسببات کے درمیان اسباب کا واسطہ حق ہے۔ جس سے مفر تو نہیں لیکن حوادث اور

امور کے جاری ہونے کو اس پر منحصر سمجھنا درست نہیں۔ کیونکہ کتاب و سنت سے اسباب کا واسطہ ہونا تو ثابت ہے لیکن ان پر انحصار کو قرار دینا غلط ہے البتہ محالاتِ عقلی ہماری بحث سے خارج ہیں۔

اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جو چیز عادتاً محال ہو وہ محال ذاتی یا ناممکن نہیں ہوتے (بلکہ ان کا وجود میں آنا ممکن ہے۔ مترجم) اسی لئے دُعا ان اُمور میں بھی قبول ہوتی ہے۔ جیسا کہ انبیاءِ کرام کے معجزات سے ثابت ہے جو ان کی دعا کی قبولیت کا نتیجہ تھے۔

تفسیر العیاشی میں امام صادقؑ سے آیۂ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ ٦
("پس میری بات مانو اور مجھ پر بھروسہ رکھو") کی تفسیر منقول ہے کہ:
"اس بات پر ایمان رکھو کہ میں تم کو مسئولہ چیزیں دینے پر قادر ہوں"

تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام صادق سے مروی ہے کہ امامؑ نے فرمایا: "وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ" (مجھ پر ہی بھروسہ رکھو) کا مفہوم یہ ہے کہ "اس بات پر یقین رکھو کہ میں تمہاری تمام مُرادیں پوری
کرسکتا ہوں اور ہر سوال کو پورا کرسکتا ہوں"۔ اور "لَعَلَّکُمْ یَرْشُدُوْنَ" ٦
(شاید وہ راہِ حق کو پالیں) کا مطلب یہ ہے کہ شاید وہ راہِ خدا کو پالیں اور خدا کی طرف رواں دواں ہوں"۔

maablib.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روزہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

اے ایمان والو! تم پر لکھ دیا گیا ہے روزہ رکھنا جس طرح لکھا گیا تھا ان پر جو تم سے پہلے تھے۔ تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

گنتی کے کچھ دن، اب جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے ہی دن کسی اور زمانے میں۔ اور جو اسے مشکل سے رکھ سکتے ہوں وہ فدیہ ادا کریں ایک محتاج کی خوراک۔ اب جو اپنی خوشی سے کچھ بھلائی کرے تو وہ اس کے لئے

خوب ہے اور روزہ رکھو تو اور بھی تمہارے لئے بہتر ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ

بقرہ ۱۸۳ تا ۱۸۵

ماہ رمضان المبارک میں قرآن نازل کیا گیا جو سراسر ہدایت تمام لوگوں کے لئے اور صحیح رہنمائی اور امتیاز حق و باطل کی کھلی نشانیوں کا حامل۔ جو شخص تم میں سے اس مہینہ کو پائے تو اس میں روزہ رکھے اور جو بیمار یا مسافر ہو تو اتنے ہی دن کسی اور زمانے میں۔ اللہ تو تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا اور یہ بھی کہ تم تعداد پوری کرلو۔ اور اس بات پر کہ اس نے تمہیں سچا راستہ دکھایا تم اللہ کی عظمت کے تقاضے کو پورا کرو اور شاید تم اس کے شکر گذار رہو۔

(۳) تفسیر (سورہ بقرآیت ۱۸۳ تا ۱۸۵)

ان آیات کا باہمی تعلق بتا رہا ہے کہ یہ تینوں آیات ایک ساتھ نازل ہوئی ہیں اس لئے کہ دوسری آیت کا ابتدائی جملہ "ایاما معدودات" پہلی آیت کے کلمۂ "صیام" سے متعلق ظرف ہے۔ اور تیسری آیت کا کلمہ "شہر رمضان" یا تو اس مبتدا محذوف کی خبر ہے جو "ایاما معدودات" (چند گنتی کے دن) کی جانب راجع ضمیر سے عبارت ہے۔ اب عبارت

یوں بنے گی "شہر رمضان ھوالذی کتب علیکم صیام" (ماہِ رمضان میں تم پر روزے فرض کیے گئے) یا پھر شہر رمضان کا جمع آیت اول کے لفظ "الصیام" سے بدل ہے۔ بہرحال "شہر رمضان" کا "جمع" "ایاماً معدودات" کا واضح بیان ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تینوں آیات کا ایک ہی موضوع ہے اور ایک ہی غرض جو ماہ صیام کے روزوں کی فرضیت سے متعلق ہے۔

آیات کا سیاق یہ بھی بتاتا ہے کہ ان آیات میں مذکور ابتدائی کلام بعد کے کلام کی تمہید اور بنیاد ہے۔ گو پہلی دو آیات تیسری آیت کا مقدمہ ہیں۔ خطرہ تھا کہ سامعین اور مخاطبین پر یہ بات بار نہ گزرے کہ ایک شاق اور بھاری فریضہ روزے کی شکل میں ان پر عاید کیا جا رہا ہے اور فطرتاً انسان ایسے فرائض گراں محسوس کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ پہلی دو آیات میں جملوں کی ترکیب ایسی ہے کہ ہر جملہ آہستہ آہستہ نرمی کے ساتھ مخاطب کے ذہن کو روزہ کی فرضیت کا احساس دلاتا ہے اور آہستہ آہستہ وحشت و اضطراب کو بتدریج ختم کرتا جاتا ہے۔ اسے تخفیف و سہولت کی انواع و اقسام جتائی جا رہی ہیں اور رعایتیں گنوائی جا رہی ہیں اور پھر آخر میں روزوں کے فوائد اور بھلائیوں کا ذکر ہے تاکہ مخاطب کا اضطراب کم ہوتا جائے اور وہ تکلیف کے تحمل کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوتا چلا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ جب پہلی آیت میں روزوں کی فرضیت کو بیان فرمایا "اے ایمان والو! تم پر لکھ دیا گیا ہے روزوں کا رکھنا" تو معاً یہ بھی فرمایا "جس طرح لکھا گیا تھا اُن پر جو تم سے پہلے تھے" گویا یہ جتانا مقصود ہے کہ اس حکم کو بھاری نہ سمجھو، وحشت میں نہ پڑو اس لئے کہ

یہ حکم صرف تم سے مخصوص نہیں کہ تم اس حکم میں تنہا اور منفرد نہیں ہو، نیز یہ بھی کہ تم اس عمل سے تقویٰ جیسی عظیم نعمت کے حصول کی توقع بھی کر سکتے ہو کہ تقویٰ روزِ قیامت کا بہترین سامان نجات ہے اسی لئے فرمایا "لعلکم تتقون" (عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ)۔

⑤ پھر یہ تسلی بھی دی کہ یہ فرض ہمیشہ رکھنے کا نہیں ہے بلکہ گنتی کے چند دن ہیں، چنانچہ فرمایا "ایاماً معدودات"۔ پھر ایاماً نکرہ لایا گیا جو تحقیر (معمولی سے دن) کو بتاتا ہے اور ایام کو محدود کہہ کر ان کی بھی کمی پر زور دیا۔ جس طرح کہ سورہ یوسف میں فرمایا:

بثمن بخس دراهم معدودة

(سورہ یوسف۔ آیت ۲۰)

اور انھوں نے یوسف کو کم قیمت پر گنتی کے چند درہموں کے عوض فروخت کیا۔

پھر فرمایا کہ جو شخص روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتا وہ فدیہ دے دے۔ فدیہ بھی اتنا مختصر جو اس پر گراں نہ گذرے (یعنی ایک مسکین کو کھانا کھلانا) پھر یہ بھی فرمایا "اب جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے ہی دن کسی اور زمانے میں" ہاں یہاں بھی یہ فرمادیا کہ فدیہ ضرور ایک سہولت ہے مگر تمہارے لئے خیر اور بھلائی اسی میں ہے کہ روزہ سستی، گرانی اور کراہت سے نہ رکھو بلکہ خوشدلی اور رغبت سے رکھو اس میں تمہاری بہتری ہے۔

کُتِبَ یعنی فرضیت کا حکم اسی لفظ کے ساتھ قصاص اور وصیت کے حکم پر بھی استعمال ہوا ہے لیکن قصاص لینا اور اقربا کے لئے وصیت کرنا

طبیعت پر بار نہیں ہوتا بلکہ مرغوب ہوتا ہے۔ اسی لئے ان احکامات کے بیان کرتے وقت کسی قسم کی تمہید ضروری نہ تھی مگر روزہ بہر حال طبیعت پر گراں گزرتا ہے اس لئے..

⑥ مخاطب کرتے ہوئے..... اے ایمان والو! فرمایا (اے لوگو نہ فرمایا) گویا اس ایمان کو للکارا جس کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ اپنے رب کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کر دے۔ اگرچہ حکم مرضی اور خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ آیت قصاص کی ابتداء بھی صاحبانِ ایمان کہہ کر فرمائی کیونکہ اُس دور میں نصاریٰ قصاص پر عفو کو ترجیح دیتے تھے۔ وصیت والی آیت کی ابتداء اس جملے سے نہ فرمائی کیونکہ اس میں کسی کو اختلاف نہ تھا اور یہاں کسی ترغیب کی ضرورت نہ تھی۔

⑦ تم پر روزے رکھ دیئے گئے جس طرح تم سے پہلوں پر لکھے گئے تھے کلمہ کتابت کے معنی معروف اور مشہور ہیں لیکن کبھی اس سے فرض یا حتمی فیصلہ مُراد لیا جاتا ہے جب کہ ارشاد ہوا:

۱۔ • كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ط (المجادلہ ۲۱)

"اللہ نے یہ بات لکھ دی کہ میں اور میرے پیغمبر (ص) غالب آ کر رہیں گے"۔

۲۔ • وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ط (یٰسٓ ۔ ۱۲)

"اور ہم لکھے جاتے ہیں اسے جو یہ آگے بھیجتے ہیں" (یٰس)

۳۔ • وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ لا

(المآئدۃ ۔ ۴۵)

"اور ہم نے اُن پر یہ فرض کر دیا تھا کہ جان کا بدلہ جان"

(المائدہ ۔ ۴۵)

کلمہ "صیام" کے معنی

صوم مصدر ہے جس کے معنی فعل سے رکنے کے ہیں مثلاً کھانے سے رُکنا، پینے سے رکنا، کلام سے رکنا، چلنے سے رکنا وغیرہ لیکن شریعت میں اس کے معنی طلوعِ فجر سے اول شب تک نیت کے ساتھ امور مخصوصہ سے رکنا ہے۔

"اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ"
جیسا کہ تم سے پہلوں پر فرض کئے

اس سے گذشتہ امم مُراد ہیں، جیسے حضرت موسیٰ (ع) اور حضرت عیسیٰ (ع) کی قومیں اس جملہ سے چند اشخاص مُراد نہیں اور نہ روزہ کا گذشتہ اُمتوں کے روزوں سے تقابل کرنا مقصود ہے تقابل صرف نفس صوم میں ہے تمام خصوصیات کا تقابل نہیں۔ بس صرف اتنا بتایا جا رہا ہے کہ گذشتہ امتوں پر بھی روزہ فرض کیا گیا تھا۔ قرآن میں اُن امتوں کی تعیین نہیں کی گئی۔ اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ایسی امتیں تھیں جن پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ موجودہ توراۃ اور انجیل میں ایسی کوئی دلیل نہیں جو صوم کی فرضیت پر دلالت کرتی ہو۔ یہ کتابیں روزہ کی صرف تعریف کرتی ہیں اور اسے ایک عظیم کام بتاتی ہیں۔ تاہم یہود و نصاریٰ آج بھی مختلف قسم کے روزے رکھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً گوشت نہ کھانے کا روزہ، دُودھ کا روزہ، یا کھانے پینے کا روزہ۔ قرآن میں بھی حضرت زکریا (ع) کا روزہ مذکور ہے۔

قرآن کے علاوہ دوسری کتب میں بھی روزے منقول ہیں۔ چنانچہ قدیم مصری، یُونانی، رُومی بھی روزے رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ روزہ کی

طرف فطری طور پر انسان مائل رہا ہے تاکہ تقرب الٰہی کو حاصل کر سکے۔

⑨ بعض حضرات " اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ " سے ——————

صرف سابق انبیاء (ع) مراد لیتے ہیں لیکن ان حضرات کی پیش کردہ روایات ضعیف اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔

" لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ "

عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ

بُت پرست اپنے معبدوں کا تقرب، رضا یا گناہ کے بعد اُن کے غضب سے بچنے کے لیے روزہ رکھتے ہیں یا انھیں جب کوئی شدید ضرورت یا حاجت درپیش ہوتی تھی تو اس میں کامیابی کے لیے روزہ رکھتے۔ اس طرح روزہ گویا باہمی معاملہ در مبادلہ ہے اُن کے خیال میں عابد روزہ رکھ کر معبود کی ضرورت کو پورا کرتا ہے تاکہ معبود اس کی ضرورت کو پورا کرے۔ وہ معبود کی خوشنودی حاصل کرتا ہے تاکہ اس کا معبود اس کی رضامندی کا خواہاں ہو۔

لیکن اسلام میں روزہ باہمی معاملہ اور مبادلہ نہیں۔ ذاتِ خداوندی، ہر قسم کے فقر و ضرورت کے تصور سے بھی بلند ہے کیونکہ ذاتِ خداوندی ہر نقص سے پاک ہے۔ اس لیے کسی طرح کی بھی عبادت ہو اس کا ہر اثر اور ہر فائدہ بندے کی طرف لوٹتا ہے اور یہی حال گناہوں کا ہے کہ اس کے اثرات بھی خود انسان ہی کی طرف لوٹتے ہیں جیسا کہ خدا نے فرمایا:

" اگر اچھے کام کرو گے تو اپنے ہی لیے اور اگر بُرائی کرو گے تو اپنے ہی حق میں "

(الاسراء ـ ۷)

⑩ روزے کے لیے " لعلکم تتقون " فرما کر گویا جتا دیا کہ روزہ کا فائدہ

تقویٰ کی شکل میں خود تمہاری ذات ہی کی طرف پلٹے گا اور یہ فائدہ بتا کر روزہ کی افادیت کو پوری طرح ثابت کر دیا۔

ہر انسان فطری طور پر یہ جانتا ہے کہ عالمِ بالا تک رسائی کی اول شرط بُری خواہشات سے کنارہ کشی ہے۔ اور خود کو مادّی فوائد کے لئے وقف کر دینا اور اُن کو اصل ھدف اور مقصدِ حیات سمجھنا انتہائی تباہ کن ہے اس رجحان اور میلان سے خود کو بچانا ضروری ہے (کہ دُنیا فانی ہے اور جان بہرحال جانی ہے) گویا ہر اس چیز سے پرہیز لازم ہے جو اس کی توجہ اپنے رَبّ سے ہٹا دے۔

ظاہر ہے کہ ایسا تقویٰ اور عمل روزہ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے کہ روزہ حقیقت میں بری خواہشات کو ترک کرنے کا نام ہے بلکہ وقتی طور پر تو مُباح خواہشات اور ترغیبات کو بھی روزہ میں چھوڑ دیا جاتا ہے جس پر لوگ اپنی منزلیں کھوٹی کر دیتے ہیں۔

مثلاً کھانا پینا مباشرت وغیرہ۔ ان سے وقتی اجتناب انسان کو ایسی قوت فراہم کرتا ہے کہ پھر وہ بہ آسانی گناہوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور قربِ خدا کی سعی کرنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مُباح خواہشات کو صرف اللہ کے حکم پر ترک کر سکتا ہے وہ اللہ کی رضامندی کے حصول کے لیئے معاصی کو زیادہ آسانی سے ترک کر دے گا۔

أَيَّامًا مَّعْدُودَٰتٍ
گنتی کے کچھ دن

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ "ایام" کو نکرہ لایا گیا ہے اور "معدودات" کو اس کی صفت۔ اس طرح روزہ کی کلفت کو معمولی بتا کر

اس کی بجا آوری کی ہمت دلائی ہے کہ "یہ تو چند دنوں کی بات ہے" اور ظاہر ہے کہ ان ایام "معدودات" سے مراد ماہِ رمضان ہے بربنائے آیت "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰن" یہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن کو نازل کیا گیا۔

بعض مفسرین نے ایام "معدودات" سے ہر ماہ کے تین روزے یا یوم عاشورا کا روزہ ۔۔۔۔ ـــــــــ یا ایامِ بیض (چاند کی ۱۳، ۱۴ اور پندرہ تاریخ) کے روزے مراد لیئے ہیں کیونکہ بقول ان کے رسول اللہ (ص) اور مسلمان یہ روزے رکھا کرتے تھے اور جب "شہر رمضان" والی آیت نازل ہوئی، تب یہ روزے منسوخ ہو گئے اور ہمیشہ کے لیئے ـــــــــ رمضان کے روزے فرض قرار پائے۔ ان مفسرین نے سند کے طور پر سنت والجماعت کے طریق سے کثیر روایات نقل کی ہیں لیکن یہ تمام روایات اختلافات اور تعارض کا شکار ہیں (اس لئے قابل اعتبار نہیں) نیز یہ کہ ان مفسرین کا استدلال دو سبب سے باطل ہے۔

⚠ اگر رمضان کے روزوں سے پہلے ۳ دن اور عاشورا کے روزے واجب ہوتے تو تاریخ انھیں محفوظ کرتی اور ان کے منسوخ ہونے میں کوئی اختلاف نہ ہوتا جبکہ ان روزوں کے ثبوت اور فسخ دونوں میں شدید اختلاف ہے۔ نیز یہ کہ یوم عاشورا کے روزے کو بطور واجب یا مستحب قرار دینا اور اسے اسلامی عیدوں کی طرح ایک عید قرار دینا بنی امیہ کی اختراع کردہ ایک بدعت ہے کیونکہ عاشورے کے دن انھوں نے کربلا کے میدان میں نبی (ص) کے نواسے اور اہل بیت (ع) کو قتل کیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا اور اس لئے اس دن کو متبرک سمجھ کر اس دن روزہ رکھنا شروع کیا اور پھر اسے عید بنا ڈالا اور

اس دن کے فضائل کی ایسی احادیث گھڑیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دن ــــ اسلامی عید ہے بلکہ اس کو جاہلیت کی عید اور حضرت موسیٰ (ع)، اور حضرت عیسیٰ (ع)، یہود و نصاریٰ سب کی عید قرار دیا حالانکہ اس میں ذرّہ برابر حقیقت نہیں۔ نہ تو یہودی اسے عید مانتے ہیں اور نہ نصاریٰ، نہ مشرکین اور نہ بت پرست اور نہ ہی مسلمان۔ یہ دن کسی تاریخ میں کسی قوم کی نجات کا دن نہیں، نہ اس روز کوئی فتح کا واقعہ رونما ہوا۔ اور نہ ہی دن سے کوئی اور دینی مسرت متعلق ہے کہ اسے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی طرح عید کا دن قرار دیا جاسکے

۵۔ ان مفسرین کے قول کی نفی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ان تینوں آیات کا سیاق اس آیت " ایاماً معدودات " کے تنہا نازل ہونے کی نفی کر رہا ہے اور نہ یہ آیت ماقبل کی آیت کی ناسخ معلوم ہوتی ہے۔ سیاق یہ ہے کہ " شہر رمضان " مبتدا محذوف کی خبر ہے یا خبر محذوف کا مبتدا ہے۔ اس صورت میں " ایام معدودات " کا بیان ہوگا۔ اس طرح یہ تینوں آیات ایک ہی کلام پر مشتمل ہیں اور ایک ہی غرض سے وابستہ۔ اور وہ غرض ماہِ رمضان کے روزوں کی فرضیت ہے۔

ارشادِ الٰہی " شہر رمضان " کو مبتدا قرار دے کر " الذی انزل فیہ القرآن " کو اس کی خبر گردانتا ہے۔ ایک ایسا نظریہ ہے جو اس آیت کو ماقبل کی آیات سے کاٹ دیتا ہے تاکہ ــــ یہ معلوم ہو کہ یہ آیت علیحدہ نازل ہوئی ہے لیکن یہ ترکیب اس آیت میں اتنی صلاحیت پیدا نہیں کرتی کہ اس آیت کو قبل کی آیت کا ناسخ قرار دیا جاسکے کیونکہ ناسخ منسوخ میں مطابقت ضروری ہوتی ہے جبکہ ان تینوں آیات میں باہم مطابقت نہیں۔ لہٰذا نسخ کا قول درست نہیں

ان لوگوں کے قول سے بھی زیادہ کمزور قول ان لوگوں کا ہے جو دوسری آیت کو پہلی آیت "کتب علیکم الصیام" تم پر روزے لکھ دیئے گئے ہیں کا ناسخ قرار دیتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ روزے نصاریٰ پر فرض تھے انھوں نے حضرت عیسیٰ (ع) کے بعد اس میں کمی بیشی کرکے ان کے پچاس دن کے روزے مقرر کیے پھر اللہ نے مسلمانوں پر بھی پہلی آیت نازل کرکے روزے فرض کیے۔ چنانچہ حضور (صلعم) نے ابتدائے اسلام میں وہی پچاس روزے رکھے۔ یہاں تک کہ دوسری آیت اتری "ایاما معدودات" والی۔ اس سے پہلا حکم یعنی پچاس روزے والا منسوخ ہوگیا اور دوسرا حکم (صرف ماہِ رمضان کے روزے) برقرار رہا۔

اس قول کا گذشتہ قول سے بھی زیادہ مہمل ہونا واضح ہے۔ کیونکہ گزشتہ قول پر وارد ہونے والے تمام اعتراضات اس پر بھی وارد ہوتے ہیں کیونکہ دوسری آیت پہلی آیت کا تکملہ ہے۔ ان لوگوں نے جن روایات پر اعتماد کیا ان کا ظاہر قرآن سے اور سیاق آیات کے خلاف ہونا ظاہر ہے۔

(۱۵) "فمن کان منکم مریضا او علیٰ سفر"

"تم میں سے جو مریض ہو یا سفر پر ہو تو اتنے ہی دن کسی اور زمانے میں"

فاء تفریع کے لیے اور پورا جملہ ارشاد الٰہی "کتب علیکم" الخ اور "ایام معدودات" پر متفرع ہے۔ "ف" یہ بتا رہا ہے کہ یہ جملہ پچھلے جملہ کا نتیجہ اور فرع ہے۔ یہ بتایا جا رہا ہے کہ روزہ تم پر فرض ہے اور وہ بھی معین دنوں کے لیے۔ جس طرح اصل فرض روزوں سے دستبرداری جائز نہیں۔ البتہ کوئی عارضہ لاحق ہو جائے تو وہ روزوں کی فرضیت کے حکم ٹال دے گا جیسے بیماری یا سفر۔ اس کا مطلب بھی یہ نہیں کہ روزوں کا وجوب ہی ختم ہوگیا بلکہ کسی

اور مساوی ایام میں روزے رکھے جائیں۔ اس حقیقت کو تیسری آیت کے جملے " ولتکملوا العدۃ " یعنی گنتی پوری کر دو سے پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔

ارشاد الٰہی " ایاماً معدودات " یعنی گنتی کے چند دن جہاں معمولی تعداد کو بتا رہا ہے وہاں یہ بھی بتا رہا ہے کہ روزے ان ہی دنوں میں فرض ہیں اور یہ فرضیّت کا ایک بنیادی رکن ہے۔

(۱۶) کلمہ " مرض " کے معنی صحت و سلامتی کا نہ ہونا ہے اور کلمہ " سفر " ماخوذ ہے س ف ر سے جس کے معنی کشف ہیں کہ مسافر گھر اور وطن سے باہر یا دور ہوتا ہے اور اپنے وطن سے باہر جانے کے لئے ظاہر ہوتا ہے گویا اللہ کا " او علیٰ سفر " فرمانا اور " مسافر " نہ فرمانا اس طرف اشارہ ہے کہ صرف وہی مسافر روزہ موخر کر سکتا ہے جو بالفعل واقعاً عملاً سفر پر ہو۔ صرف مستقبل کا سفر اس حکم کے دائرہ میں نہیں آتا۔

بہت سے اہلسنت والجماعت کے علماء نے اس چھوٹ کو رخصت قرار دیا عزیمت نہیں مانا۔ گویا مریض یا مسافر کو روزہ رکھنے کا اختیار ہے لیکن یہ قول کمزور ہے کیونکہ ارشاد الٰہی " فعِدّۃ من ایام اُخر " (گن کر اور دنوں میں رکھ لے) اس سے معلوم ہوا کہ یہ رخصت نہیں بلکہ عزیمت (وجوب) ہے۔ ائمہ اہلبیت (ع) سے بھی یہی مروی ہے۔ اور صحابہ کی ایک جماعت مثلاً عبدالرحمن بن عوف، عمر بن الخطاب، عبداللہ بن عمر ابوہریرہ اور عروہ کا بھی یہی موقف ہے۔

" وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین "

" اور جو اسے مشکل سے رکھ سکتے ہوں وہ فدیہ ادا کریں ایک محتاج کی خوراک "

کلمہ " یطیقون " کا مصدر " اطاقہ " ہے جس کے معنی فعل کی انجام دہی

میں پوری طاقت صرف کرنے کے ہوتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فعل اس قدر دشوار ہے کہ جس کی انجام دہی میں تمام تر توانائیاں صرف ہوں۔

فدیہ کے معنی بدل یا عوض ہے۔ یہ فدیہ بھی مریض اور مسافر کے روزہ قضا کرنے کے حکم کی طرح واجب ہے کیونکہ "علی الذین" کے الفاظ وجوب پر دلالت کر رہے ہیں، رخصت یا اختیار پر نہیں۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ جملہ رخصت کا فائدہ دیتا ہے۔ بعدازاں اسے منسوخ کر دیا گیا۔ پہلے اللہ نے روزہ رکھنے والے تمام لوگوں کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ چاہیں تو وہ روزہ رکھیں ورنہ روزے کے ہر دن کا ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ اور اس میں سہولت کا سبب یہ تھا کہ اس وقت لوگ روزہ کے عادی نہ تھے اور پھر یہ اجازت ارشاد الٰہی "فَمَنْ شھد منکم الشھر فلیصمہ" (تم میں جو اس مہینے میں اپنی جگہ پر ہو تو اس کو چاہیے کہ روزہ رکھے) سے منسوخ کر دیا گیا۔

ان ہی مفسرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ حکم صرف روزوں پر قدرت رکھنے والوں پر منسوخ ہوا ہے۔ بوڑھوں، حاملہ عورتوں اور دودھ پلانے والیوں کے لئے منسوخ نہیں ہوا۔

مولف تفسیر المیزان کہتے ہیں کہ بھلا یہ تو قرآن مجید کے ساتھ مذاق کرنے کے مترادف ہے اور آیاتِ الٰہی کو پارہ پارہ کر دینا ہے جبکہ تینوں آیات کے کلام کی غرض ایک ہی ہے اُن کا ایک ہی سیاق ہے تمام جملے باہم مربوط اور ایک اکائی ہیں۔ ان مفسرین کی بات درست ہو تو گویا ہر جملہ دوسرے کی نفی کر رہا ہے۔ اور آیتوں کا ابتدائی حصہ آخری حصے کو رد کر رہا ہے پہلے یہ کہنا کہ روزے فرض کئے گئے۔ پھر یہ کہنا کہ قادر لوگوں کے لئے

افطار اور فدیہ جائز ہے۔ پھر یہ کہنا کہ جو شخص اس مہینہ کو پائے تو اس میں روزہ رکھے۔ اور پھر اس کے بعد قادر لوگوں کے حق میں فدیہ کا حکم منسوخ کرنا اور غیر قادر لوگوں کے حق میں فدیہ کا حکم غیر منسوخ رکھنا جبکہ غیر قادر لوگوں کا حکم قطعاً بیان ہی نہیں ہوا، یہ سب کچھ کس قدر لولا، کمزور اور بے سروپا توجیہات پر مبنی ہے۔ بات کو بار بار توڑا موڑا گیا ہے۔ قدم قدم پر تضاد ہیں یہ سب ایک فاسد مقدمہ پر فاسد مقدمہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱۹) "فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ"

"اور جو اپنی مرضی سے بھلائی کرے تو وہ اس کیلئے خوب ہے"

"تَطَوُّعٌ" کا مادہ ط۔ و۔ ع ہے یہ کراہت کی ضد ہے جس کے معنی برضا و رغبت کسی کام کو انجام دینا ہے۔ اگر یہ "تفعّل" کے باب میں ہو تو اس میں اخذ و قبول کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب "تطوّع" کے معنی ہوں گے "انسان کا کسی کام کو برضا و رغبت بغیر کراہت اور ناپسندیدگی انجام دینا، خواہ وہ کام لازمی ہو یا غیر لازمی"۔

(۲۰) لیکن عموماً یہ لفظ مستحب اور غیر واجب افعال کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ غیر واجب کام ہی انسان برضا و رغبت انجام دیتا ہے جبکہ واجب یا فرض کام میں فرضیت کے باعث جبر و اکراہ کا شائبہ بہرحال ہوتا ہے۔ ویسے لفظ تطوع اپنے مادہ اور ہیئت کے اعتبار سے واجب اور غیر واجب دونوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے اور "ف" کے سبب مفہوم کا ماحصل یہ ہے کہ "روزہ تم پر فرض کیا گیا ہے" اس میں تمہاری خیر اور بھلائی کی رعایت کی گئی ہے۔ نیز اس فریضہ کی ادائیگی کے سبب تم گذشتہ امتوں کا ایک حصہ ہو جاتے ہو۔ البتہ تمہارے لئے اس میں تخفیف اور سہولت کا بھی پہلو رکھا گیا ہے۔ اس لئے مجبور ہو کر نہیں بلکہ برضا و رغبت

اس کام کو انجام دو ۔ اس لیے کہ اس انداز میں کارِ خیر انجام دینا بے بس ہو کر انجام دینے سے کہیں بہتر ہے ۔ گویا یہ صرف روزہ سے مخصوص نہیں بلکہ مطلقاً ہر کارِ خیر میں تطوّع بہتر ہے ۔

بہت سے مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ جملہ فدیہ سے متعلق ہے ۔ دونوں جملوں کو مربوط کرنے سے معنی یہ ہونگے کہ کوئی شخص اگر ایک مسکین سے زیادہ کو کھانا کھلا دے تو یہ فدیہ دینے والے کے لئے بہتر ہے ۔ لیکن یہ تفسیر معقول نہیں اس لئے کہ اس طرح فاءِ تفریع بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے ۔ اور تطوع کو مستحبات سے مختص کرنے کی کوئی دلیل نہیں ۔ نیکی اور خیر میں رضا و رغبت اور مقدارِ معینہ سے زائد میں رضا و رغبت دو مختلف چیزیں ہیں ۔ اس لئے حکم تطوع میں اضافہ ثابت کرنے کی کوئی معقول دلیل نہیں نظر آتی ۔

اِن تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون	یہ جملہ سابقہ جملہ کا
اور روزہ رکھو تو تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم واقف ہو	تتمہ ہے ۔ اس کے

معنی یہ ہوں گے کہ فرض شدہ روزوں کو رضا و رغبت سے پورا کرو ۔ کیونکہ نیکی میں رضا و رغبت بہتر ہے ۔ اور روزہ تمہارے لئے نیکی اور خیر ہے لہذا اس کو برضا و رغبت انجام دینا نیکی پر نیکی اور بھلائی پر بھلائی ہے ۔

بسا اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ خطاب کہ "تمہارے لئے روزہ بہتر ہے" صرف معذور لوگوں کے لئے ہے ۔ اس میں قادر مسلمان شامل نہیں ۔ کیونکہ اُن پر تو روزہ پہلے ہی فرض ہے اور یہاں روزہ رکھنے کو قابلِ ترجیح بنایا جا رہا ہے کیونکہ ترجیح کے مقابل غیر راجح بھی ہوتا ہے چنانچہ اس جمع سے روزہ کا استحباب (غیر واجب ہونا) ثابت

ہوتا ہے۔ جبکہ سب کو معلوم ہے کہ روزہ فرض ہے تو لامحالہ اس جملہ کو ترجیح اور استحباب پر محمول کرنا پڑے گا جیسے مریض اور مسافر وغیرہ جس کو افطار کی اجازت ہے اُن کے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔ لیکن اس تفسیر پر کئی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

(۱) اس طرح کی تفصیل کی کوئی دلیل نہیں۔

(۲) پھر جملوں کی ساخت مختلف ہے فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا (جو شخص تم میں بیمار ہو) یہ جملہ غائب کے صیغے میں ہے اور اِنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (اگر تم روزہ رکھو تو تیرے لئے بہتر ہے) مخاطب کے صیغے میں ہے۔ اصولاً دونوں جملے غائب کے صیغے سے آنے چاہیئے تھے۔ جب تو یہ تفسیر درست ہوسکتی تھی تصوموا کی جگہ یصوموا اور لکم کی جگہ لھم ہوتا) اس سے معلوم ہوا کہ ان تصوموا خیر لکم (اگر تم روزہ رکھو تو تمہارے لئے بہتر ہے) کا جملہ مریض اور مسافر سے مخصوص نہیں۔

(۳) جملہ اول مریض اور مسافر کو روزہ رکھنے کی رخصت (اجازت دے رہا ہے) ترجیح بیان نہیں کر رہا۔ بلکہ اس کے بعد کا جملہ "فعدۃ من ایام اُخر" (کسی اور زمانے میں روزہ رکھو) صراحت سے بتا رہا ہے کہ یہ لوگ دیگر ایام میں روزہ قضا کریں لہذا اس کو ترک روزہ کی بجائے ترجیح روزہ پر محمول کرنا کیسے درست ہوگا؟

شھر رمضان الذی اُنزل فیہ القرآن ھدی للناس ماہ رمضان جسمیں قرآن نازل کیا گیا سراسر ہدایت ہے تمام لوگوں کیلئے	ماہ رمضان نواں قمری مہینہ ہے اور قرآن میں

سوا اس مہینے کے کسی اور ماہ کا ذکر نہیں۔

نزول کے معنی بلند مقام سے نیچے اترنے کے ہیں ۔ انزال اور تنزیل میں یہ فرق ہے کہ انزال ایک ہی مرتبہ ایکبارگی ہوتا ہے اور تنزیل بتدریج اتارنے کو کہتے ہیں ۔

اور قرآن اللہ کی طرف سے اسکے نبی محمدؐ پر نازل شدہ کتاب کا نام ہے اور اس کا نام قرآن باعتبار مقروء (پڑھا ہوا) کے ہے ۔ قرآن کا لفظ پوری کتاب کے لئے بھی اور اس کے بعض اجزاء کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔

آیت سے واضح ہو رہا ہے کہ قرآن مجید کا نزول ماہ رمضان میں ہوا جبکہ سورہ اسراء میں ارشاد ہوا ۔

اور قرآن کو ہم نے جُدا جُدا رکھا ہے تاکہ آپ سے لوگوں پہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے اسے اتارا بھی بتدریج ہے ۔"

اس سے قرآن کا تیئیس ۲۳ سال میں بتدریج نزول ثابت ہوتا ہے ۔ اور تاریخ اور تواتر سے بھی تدریجی نزول ثابت ہے ۔ اسی لئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذکورہ بالا دونوں آیات کے مفاہیم ایک دوسرے کے خلاف ہیں ۔

اس بات کا ایک جواب تو یہ دیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کا نزول دوبار ہوا ۔ ایک مرتبہ ماہِ رمضان میں ہوا ۔ جب قرآن لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر اُترا پھر تیئیس ۲۳ سال میں بقدر ضرورت بتدریج نازل ہوتا رہا ۔ یہ جواب روایات سے ماخوذ ہے جو بعد میں بیان ہونگی ۔

اس جواب پر یہ اعتراض ہے کہ خدا نے جہاں یہ فرمایا کہ رمضان میں قرآن اتارا گیا ۔ اسی کے فوراً بعد فرمایا " جو لوگوں کیلئے ھدایت اور صحیح رہنمائی ہے "

ایسے قرآن کا آسمانِ دنیا پر معطل رہنا اور لوگوں تک نہ پہنچنا، لوگوں کے لئے کیسے ھدایت ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ہدایت ہونے کے باوجود چند سال آسمانِ دنیا پر معلق رہنا، ہدایت کے منافی نہیں۔ کیونکہ جیسے جیسے اس کی ہدایت کی ضرورت پیش آتی رہی ویسے ویسے اس کے اجزا کو نازل کیا جاتا رہا۔ اور اس طرح یہ کارِ ہدایت انجام دیتا رہا۔ ایسے قوانین کی بے شمار مثالیں ہیں کہ قانون موجود ہوتا ہے مگر معطل رہتا ہے۔ جیسے ہی اس کی ضرورت پیش آتی ہے وہ قانون اور اس کے نافذ کرنے والے حرکت میں آجاتے ہیں۔

مولف کہتے ہیں کہ قوانین اور خطابات میں فرق ہے۔ خطابات میں خطاب سے قبل مخاطب کا وجود ضروری ہے۔ اگرچہ تھوڑی سی مدت کے لئے کیوں نہ ہو (مگر خطاب ہو اور مخاطب نہ ہو یہ لایعنی چیز ہے)۔ علاوہ ازیں قرآن ناسخ بھی ہے اور منسوخ بھی۔ اب ناسخ منسوخ دونوں طرح کی آیات کا ایک ہی زمانے میں نزول چہ معنی دارد؟

بسا اوقات اس کا جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ ماہِ رمضان میں نزولِ قرآن سے مراد اس کی اولین اور ابتدائی نازل شدہ آیات کا نزول ہے یعنی نزول کی ابتدا۔ مگر اس پہ یہ اعتراض ہے کہ حضور ۲۷ رجب کو مبعوث برسالت ہوئے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مہینہ تک آپ نزولِ قرآن سے محروم رہے ہوں؟ جبکہ سورۂ علق کا متن خود بتاتا ہے کہ یہ سورہ بعثت کے ساتھ نازل ہوا۔ اس لئے یہ کہنا کہ اولین آیت رمضان میں نازل ہوئی، دُور کی کوڑی لانا ہے۔

اس کے علاوہ یہ آیت کہ " رمضان کا مہینہ وہی ہے جس میں قرآن

نازل کیا گیا"۔ صراحتاً نہیں بتاتی کہ یہاں نزول سے مُراد صرف ابتدائی حصہ ہے اور نہ کلام میں کوئی ایسا قرینہ ہے جو اس کا موید ہو۔ اس کے علاوہ دوسری آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید پورا ایک وقت نازل ہوا ہے۔ مثلاً

۱۔ سورہ الدخان ۲۰۳ | قسم ہے اس کتاب واضح کی اس کو ایک برکت والی

رات میں اتارا ہے۔ کیونکہ ہم بندوں کو خبردار کرنے والے تھے۔

۲۔ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ قدر ۱ | "بیشک ہم نے (قرآن کو)

شب قدر میں اُتارا۔"

یہ آیات بتا رہی ہیں کہ قرآن ایک بار ہی نازل ہوا کہ اس میں انزل ہے تنزیل نہیں۔ انزل ایک بار اُتارنے کو کہتے ہیں اور انزال جستہ جستہ اتارنے کو کہتے ہیں۔ (مترجم) اس لئے اس سے صرف اولین آیات کا نازل ہونا مراد نہیں۔ مولّف "المیزان" نے اس مشکل بحث کو بڑی تفصیل سے لکھا، اور آخر میں سورۂ یونس کی درج ذیل آیت کا حوالہ دیا اور اس کے ذریعہ اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ (مترجم)

سورۂ یونس میں ہے "حاٰم۔ میم۔ قسم ہے اس کتاب واضح کی کہ ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن مجید بنایا ہے۔ تاکہ تم خوب سمجھ جاؤ، اور بیشک وہ لوح محفوظ میں ہمارے پاس ہے۔ بڑے مرتبہ کا حکمت والا۔ (سورہ زخرف ۴-۱)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن اس سے قبل کتاب مبین میں تھا جو مقروء (یعنی پڑھا ہوا) عربی میں نہ تھا۔ اسے بعد میں عربی زبان کا جامہ پہنایا گیا تاکہ لوگ اسے سمجھ سکیں۔ مگر اس سے پہلے کہ اسے قراءت اور عربی کا جامہ پہنایا جائے، یہ قرآن ام الکتاب میں عالی مقامات میں موجود تھا۔ ایسے مقام بلند میں کہ جہاں اہلِ خرد کی بھی رسائی ممکن نہ تھی۔ نہ وہ آیات و سورتوں میں منقسم تھا۔

کتاب مبین سے مراد وہی اصل کتاب ہے جو بعد میں عربی کا جامہ پہن کر ہمارے سامنے آئی۔ یہ قرآنِ عربی اُسی اصل کتاب کو واضح اور روشن کرنے والا ہے۔ سُورۃ واقعہ کی آیات بھی یہی بتاتی ہے کہ قرآن مجید کتاب مکنون میں مندرج اور نہاں تھا۔ ایسی کتاب جسے وہاں اللہ کے مخصوص پاکیزہ بندوں کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا تھا اور قرآن مجید کی تنزیل کا عمل بعد کا عمل ہے۔

سورۂ واقعہ کی آیت یہ ہے:

"میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے ڈوبنے کی۔ اور اگر سمجھو تو یہ ایک بڑی قسم ہے کہ یہ ایک معزز قرآن ہے ایک محفوظ کتاب میں پہلے سے درج) جسے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا بجز پاکوں کے اُتارا ہوا ہے پروردگار عالم کی طرف سے۔" (واقعہ ۷۵-۸۰)

معلوم ہوا کہ تنزیل سے قبل قرآن اغیار کی نگاہوں سے مستور کتاب مکنون میں نہاں تھا۔ اسی کتاب مکنون کو سورۂ زخرف میں 'ام الکتاب' اور سورۂ بروج میں 'لوحِ محفوظ' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ لوح تغیر و تبدل سے محفوظ ہے اسی لئے اس کو محفوظ کا نام دیا گیا اور یہ کتاب مبین جو اصل قرآن ہے تفصیل و تدریج سے بھی مبرا ہے۔ قرآن مجید تو

اس کے لیے بمنزلۂ لباس ہے اور اس اصل کتاب کو قرآن بھی تعبیر کیا گیا ہے،
جیسے کہ فرمایا۔

بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ بلکہ یہ بزرگی والا قرآن ہے لوحِ محفوظ میں	اور ماہِ رمضان میں یا لیلۃ المبارکہ یا

لیلۃ القدر میں اس اصل قرآن، کتابِ مبین کے نزول کی بات ہو رہی ہے اور ان آیات سے اس حقیقت کتاب اور کتابِ مبین کا یکبارگی قلبِ نبیؐ پر نزول مراد ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے قرآنِ مفصل تیئس ۲۳ سالہ مدت میں بتدریج نازل ہوا۔

دوسری آیات سے اسی لئے یہ پتہ چلتا ہے کہ رسولؐ پہلے سے جانتے تھے کہ آپ پر کونسی آیات نازل ہونگی۔ اسی لئے آپ کو وحی کے اختتام سے قبل قرأت میں عجلت کرنے سے منع فرمایا گیا۔

ارشاد ہوا:

ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیک وحیہ (طٰہٰ ۱۱۴)	اور آپ قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کیجئے قبل اس کے آپ پر

پوری وحی نازل ہو چکے۔

یہی حقیقت کتاب اور کتابِ مبین ہے جو رمضان مبارک کی ایک رات میں یکبارگی، قلبِ رسولؐ پر اتری۔ اس لئے ارشادِ خداوندی ہے کہ:

"ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا"

اسی طرح یہ بات بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ یہ واقعہ رات میں ہوا

جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے :

"ہم نے اس کو ایک برکت والی رات میں اتارا ہے" (دخان - ۲) اور یہ بھی بدیہی ہے کہ یہ رات رمضان کی ایک رات تھی ۔

اگرچہ پورا قرآن اس شب ہی لفظاً نازل نہیں ہوا لیکن سورۂ الحمد لفظاً نازل ہوئی اور اس کا نازل ہونا گویا اس رات میں پورے قرآن کا نازل ہونا ہے علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لفظ قرآن کا اطلاق جس طرح کل قرآن پر ہوتا ہے اسی طرح بعض اجزاء پر بھی ۔ بلکہ قرآن کا اطلاق تو قرآن کی اصطلاح کے مطابق تمام گذشتہ کتبِ سماوی پر بھی ہوتا ہے ۔

یہی مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ رمضان میں نزولِ قرآن کے معنی سورۂ الحمد کا نزول ہے اور اس سے قرآن کا لیلۃ القدر میں نازل ہونا بھی درست ہو جاتا ہے ۔

اس لئے یہ روایات ناقابلِ اعتبار ہیں ۔

یہی مفسرین لکھتے ہیں کہ اس موضوع کی اور بھی روایات ہیں جن سے نزولِ قرآن کے رمضان میں ہونے کے معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ قرآن بعثت سے قبل لوحِ محفوظ سے بیت المعمور کی طرف اترا جبرئیل نے اسے وہاں فرشتوں کو املا کرایا پھر بعثت نبوی کے بعد بتدریج نبی پر اس کا نزول ہوتا رہا ۔ ان مفسرین کے نزدیک یہ روایات اوہام و خرافات پر مبنی ہیں جنھیں غیر مسلموں نے اسلامی روایات میں خلط ملط کر دیا ہے ، یہ روایات قرآن کے خلاف ہیں ۔ ان میں لوحِ محفوظ کو ماورئ طبیعی اشیاء میں سے مانا گیا ہے حالانکہ لوحِ محفوظ سے مراد عالم طبیعی اور بیت المعمور سے مراد کرۂ ارض ہے جو انسانوں کی آبادی کے سبب معمور و آباد ہے

اِن تمام روایات کے بارے میں مولّف "المیزان" کہتے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سے قول کی اصلاح کی جائے کیونکہ اس کے تمام اقوال فاسد مقدمات پر

مبنی ہیں۔ بس اس کے بارے میں یہ مصرعہ پڑھا جا سکتا ہے ؎

"تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

(ترجمہ: سارا جسم ہی داغ داغ ہے روئی مرہم کہاں کہاں رکھوں)

سب سے پہلے تو اس مفسر نے خود ساختہ تاریخ بعثت بیان کی، پھر پہلی نازل شدہ سورۃ بیان کیا۔ پھر کہا کہ نزولِ قرآن کے وقت حضورؐ راستے میں تھے پھر آپ کو نماز کی تعلیم دی گئی۔ پھر تھکاوٹ اس قدر طاری ہوئی کہ حضورؐ رات بھر سوتے رہے۔ صبح ہوئی تو آپ پر سورۂ المدثر نازل ہوئی۔ یہ تمام خود ساختہ بے سروپا باتیں ہیں۔ نہ کوئی محکم آیت اُن کی موئد ہے نہ سنتِ قائم۔ یہ تخیلاتی من گھڑت قصے ہیں جن کو کتاب و سُنت سے کوئی میل نہیں۔ اس لئے اس قسم کے مفسرین نے قرآن و سُنت سے کوئی دلیل نہیں پیش کی اور نہ پیش کر سکتے ہیں اور اس پر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ان باتوں کو مسلمات میں شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب حقیقت کے بالکل خلاف ہیں۔ از روئے سُنت یہ مسئلہ مسلمات میں سے نہیں ہے کیونکہ سُنن پر مشتمل تمام عام و خاص کتابیں خواہ سُنی کتب ہوں یا شیعہ کتب، سب کی سب دوسری صدی ہجری کے بعد کی ہیں۔ اگرچہ مفسرین نے اعتراض شیعہ کتابوں کی بنیاد پر کیا ہے۔ اگر شیعہ کتب میں خلط ملط ہوا ہے تو دیگر کتب میں خلط ملط کیوں نہ ہوا ہوگا؟ رہیں کتب تاریخ تو وہ ان تفاصیل سے خالی ہیں اور اُن میں تو بہت زیادہ طب دیابس کا احتمال ہے۔

اس کے بعد مولف المیزانؒ نے ان گمراہ مُفسّرین کی آرا کو بہت تفصیل سے

بیان کیا ہے اور اُن کے دلائل بھی نقل کیے ہیں جو بہت کمزور ہیں جن کا ترجمہ کرنا فضول ہے محض تضییع اوقات ہے۔ آخر میں مولّف المیزان ان غلط تفسیروں پر اس طرح رقمطراز ہیں ــــ (مترجم)

" مذکورہ بالا مفسّر کا یہ کہنا کہ قبل از بعثت قرآن شب قدر میں لوحِ محفوظ سے ایک ہی مرتبہ بیت المعمور کی طرف نازل ہوا پھر بتدریج حضورؐ پر نازل ہوا، غلط ہے اور من گھڑت خرافات پر مبنی ہے۔ بالکل غلط تنقید ہے۔ اس مفسّر کے دلائل بالکل بودے ہیں کہ لوحِ محفوظ عالمِ طبیعی اور بیت المعمور سے مُراد کرۂ ارض ہے اس لیے کہ

(۱) ــــ • قرآن مجید کی کوئی آیت ان روایات کے خلاف نہیں۔

(۲) ــــ • روایات میں کہیں نہیں ہے کہ قبل از بعثت قرآن ایک ہی دفعہ پورے کا پورا بیت المعمور کی طرف نازل ہوا ــــ یہ ایک ہی مرتبہ کا جملہ مفسّر نے خود سے لگایا ہے اور اس نے ان روایات پر غور و فکر بھی نہیں کیا۔

(۳) ــــ • لوحِ محفوظ کا عالمِ طبیعی سے تفسیر کرنا نہایت بھونڈی اور مضحکہ خیز تفسیر ہے ان دونوں میں کیا مناسبت ہے؟ کیا عالمِ طبیعی تغیّر و تبدّل سے محفوظ ہے جبکہ ہر لمحہ تغیّر کا عمل اس پر جاری و ساری ہے۔ یہ تو عالمِ تغیّر و حرکت ہے یہ عالمِ فساد، تباہی، تغیّر تبدّل سے کہاں محفوظ ہے کہ اسے لوحِ محفوظ قرار دیا جائے اور نہ اس کے اسرار نا اہل کی آگاہی سے محفوظ ہیں۔ جن کے لئے قرآن نے کہا:

" یہ ایک معزز قرآن ہے ایک محفوظ کتاب میں

پہلے سے درج، جسے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا بجز
پاکوں کے۔" (سورہ واقعہ ۷۷)

اس تفسیر پر اور کئی اعتراضات وارد کئے جا سکتے ہیں۔

اور اگر اس مفسر کا یہ کہنا درست ہو کہ "شب قدر میں رسول اللہ پر نزولِ قرآن سے مراد سورۂ فاتحہ کا نزول ہے کہ یہ سورت تمام معارف قرآنی پر مشتمل ہے تو پھر یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ "پورے قرآن کا یکبارگی نزول سے مراد قلبِ رسولؐ پر قرآن کے اجمالی معارف کا نزول ہے۔" اس دوسرے قول کے لئے کوئی مانع نہیں ہے۔

ھُدًی لِلنَّاسِ وَبَیِّنَاتٍ مِنَ الھُدٰی وَالفُرقَان

(یہ قرآن) "ھدایت ہے تمام لوگوں کے لئے اور صحیح رہنمائی اور امتیاز حق و باطل اور کھلی ہوئی نشانیوں کا حامل ——————"

"النّاس" لوگوں سے مراد معاشرے کے عام افراد ہوتے ہیں جن کی فکری سطح عموماً کمزور ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس لفظ کا اطلاق بکثرت ایسے ہی افراد پر ہوا ہے۔ جیسے کہ فرمایا:

"لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔" (روم — ۳۶)

"ہم ان مثالوں کو لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں، اور انھیں بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔" (عنکبوت ۴۳)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ "الناس" یعنی لوگوں کے زمرے میں علماء شامل نہیں۔ بلکہ علماء سے مراد صاحبانِ فہم و فراست، کیونکہ لوگوں کی زندگی کی اساس اندھی تقلید پر ہوتی ہے، دلیل و برہان اور امورِ معنوی میں تمیز و تشخیص و تحقیق ان کے بس کا روگ نہیں۔ اگر یہ لوگ دلائل کی مدد سے حق و باطل میں

امتیاز کر سکتے تو انھیں دوسرے راہ کیوں دکھاتے۔ مگر قرآن اُن کے لئے بھی ہدایت کا سامان ہے۔ اس کی روشنی میں یہ لوگ بھی حق و باطل میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

رہے خواص جنھوں نے علم و عمل سے اپنی تکمیل کرلی تو وہ انوارِ الٰہیہ سے روشنی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ حق و باطل میں بدرجہ اتم تمیز کر سکتے ہیں۔ قرآن اُن کے حق میں فرماتا ہے:

"اس (قرآن) کے ذریعہ سے اللہ انھیں
سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی رضا کی
پیروی کرتے ہیں اور انھیں اپنی توفیق سے
نور کی طرف تاریکیوں سے نکال کر لاتا ہے اور
انھیں سیدھی راہ دکھلائے رہتا ہے" (مائدہ ۱۶)

اس تفسیر سے ہدایت (ھُدیً) اور ہدایت کے واضح دلائل (بینٰت) کا تقابلی فرق واضح ہو گیا۔ ان میں تقابل عام و خاص کا تقابل ہے۔ قرآن بعض افراد کے لئے ہدایت اور بعض کے لئے واضح دلائل (بینٰت) ہے۔

شہادۃ کے اصلی معنی

فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ
"تو جو شخص تم میں سے اس مہینہ کو پائے تو وہ اسمیں روزہ رکھے"

حاضر ہونا اور علم رکھنا ہے۔ جس کا حاصل خبر اور پختہ گواہی ہے۔ رمضان کی شہادت کے معنی رمضان کے چاند کا طلوع ہونا اور اس کی اطلاع ہونا ہے۔ لیکن شہود ماہ سے چاند کی رویت مراد لینا

اور انسان کا سفر کے بجائے گھر میں ہونا مراد لینا صحیح نہیں ہے۔
کیونکہ آیت کے الفاظ میں اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ البتہ قرائن سے ایسا مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے لیکن خود آیت میں ایسا کوئی قرینہ واضح طور پر موجود نہیں اسی لئے اسے رؤیت ہلال پر محمول کرنا درست نہیں۔

وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

اور جو بیمار ہو یا مسافر ہو تو اتنے ہی کسی اور دنوں میں

یہ جملہ تاکیداً نہیں اور نہ تکرار ہے۔ کیونکہ پہلی دو آیات حکم کا بیان کے طور پر نہ تھیں بلکہ بطور تمہید تھیں۔ صرف زیر بحث تیسری آیت ہی حکم بیان کر رہی ہے۔ لہذا یہ تکرار نہیں ہے۔

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ

اللہ تو تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا اور یہ بھی کہ تم تعداد پوری کرو۔

یہ جملہ استثنائی حکم علت کو بیان کر رہا ہے۔ مریض اور مسافر کے لئے روزہ کا حکم اور سال کے دیگر ایام میں رکھنا تکلیف اور تنگی کو دور کرتا ہے کہ اللہ کو سہولت مطلوب ہے اور آخری جملے نے کہ "تم تعداد پوری کرو" بتا دیا کہ رمضان کے قضا روزوں کو سال کے دوسرے ایام میں پورا کرنا ضروری ہے۔ اس طرح افطار اور تکمیل دونوں کی وجہ بیان ہو گئی۔ "تاکہ تم تعداد پوری کرو" غایت کے لئے ہے۔ اور یہ جملہ "یرید" پر معطوف ہے کیونکہ وہ جملہ بھی غایت بتا رہا ہے۔ اب کلام کے معنی یہ ہوئے کہ

"اگر ہم نے تمہیں افطار اور قضا کا (سفر یا مرض میں) حکم دیا ہے تو اسکا مقصد تمہاری تکلیف اور بوجھ کو کم کرنا ہے اور قضا کا حکم

اس لئے ہے کہ تمہارے روزوں کی تعداد پوری اور مکمل ہو جائے۔" تاکہ بندہ وقتی طور پر محروم ہو کر نعمتوں کی دل سے قدر کرنا سیکھے اور قرآن کی شکل میں اللہ کی ھدایت ملنے پر روزہ کے علاوہ بھی اس کا شکر گذار ہو۔ (مترجم)

روایات پر بحث

حدیثِ قدسی (یعنی ایسی حدیث جس میں سند کا سلسلہ اللہ تک پہنچتا ہو) میں اللہ کا ارشاد ہے کہ "روزہ فقط میرے لئے ہے اور میں ہی اسکی جزا دیتا ہوں۔"

مؤلف المیزان فرماتے ہیں کہ: اس حدیث کو شیعہ و سنی دونوں نے معمولی سے اختلاف سے روایت کیا ہے۔ روزہ کا اللہ ہی کے لئے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ روزہ واحد عبادت ہے جو عدمی امور سے تشکیل پاتی ہے۔ جبکہ دوسری عبادتیں جیسے نماز، حج، جہاد وغیرہ وجودی اور اثباتی امور سے ترتیب پاتے ہیں۔ اور وجودی یا اثباتی افعال عبدیت اور ربوبیت کے اظہار میں خالص نہیں ہوتے۔ کیونکہ وجودی افعال انانیت کے اثبات، مادی نقائص اور محدودیت کی آفات سے خالی نہیں ہوتے کیوں ان افعال میں غیر اللہ کا حصہ ہونا ممکن ہوتا ہے یعنی ان افعال میں قدرے اخلاص ہوتا بھی ہے اور قدرے شہرت یا کوئی اور مادی فائدہ بھی مطلوب ہوتا ہے لیکن جو عمل نفی اور عدمی امور پر مشتمل ہو جیسے روزہ (نہ کھانا، نہ پینا، فلاں فلاں کام نہ کرنا) اس میں یہ خرابیاں نہیں پائی جاتیں کہ روزہ کے ذریعہ روزہ دار خود کو نفسانی خواہشات سے ملوث ہونے سے بچاتا ہے۔

اس لئے عُدمی امور میں غیر اللہ کا حصّہ نہیں ہوتا۔ یہ بندے اور پروردگار سے درمیان کا معاملہ ہوتا ہے اور اس پر خدا کے سوا کوئی مطلع نہیں ہوتا۔

اللہ کا یہ کہنا " انا اجزی بہ " یعنی "میں ہی اس کی جزا دونگا" اگر اس کو صیغہ معروف سمجھیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ روزہ کا اجر عطا فرماتے وقت اللہ اور بندے کے مابین کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ بندے نے اس عبادت میں کسی غیر کو شریک نہیں کیا اور کوئی بھی اللہ کے سوا اس عبادت سے مطلع نہیں ہوا اس لئے عطائے اجر میں بھی اب کوئی دخیل نہیں ہوگا۔

اسی انداز سے خدا نے صدقات کے بارے میں واضح طور پر فرمایا کہ :-

" وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ " اللہ صدقات کو کسی توسط کے بغیر خود قبول فرماتا ہے۔ (التوبہ ۱۰۵)

اور اگر اس حدیثِ قدسی کو بصیغہ مجہول پڑھیں تو اس کے معنی ہوں گے کہ "میں خود اس کا اجر ہوں" یعنی روزے کا اجر اللہ کا قرب یا اللہ کی رضا ہے (جس سے بڑا اور کوئی مرتبہ نہیں ہوسکتا)۔

: الکافی میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ اوائل بعثت میں رسول اللہؐ اتنے روزے رکھتے تھے کہ کہا جاتا تھا کہ کبھی روزہ ترک ہی نہیں کرینگے اور اس قدر روزے چھوڑ دیتے تھے کہ کہا جاتا تھا کہ اب آپ روزہ نہیں رکھیں گے۔ پھر آپ نے یہ طریقہ ترک کر دیا۔ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن ترک فرماتے۔ یہ حضرت داؤدؑ پیغمبر کا طریقہ ہے۔ پھر آپ نے یہ طریقہ بھی ترک کر دیا اور ایام بیض (ہر ماہ کی تیرہویں، چودھویں اور پندرھویں) کے روزے رکھنے لگے تھے پھر آپ نے یہ طریقہ بھی ترک فرما دیا۔

اُدھر دس تولا ہیں دو جبعراتوں اور اُن کے درمیان ایک بدھ کا روزہ رکھتے یہی معمول آخر عمر تک رہا۔

"غالباً ان مختلف طریقوں سے روزہ رکھنے کو اپنی
سُنت بنانا مقصود تھا تاکہ اب جو جس طرح چاہے اِن
طریقوں میں کوئی طریقہ اختیار کر کے مستحبی روزے رکھے۔ (مترجم)

عبد العابد سے مروی ہے کہ رسول کا وصال ہوا آپکا معمول شعبان اور رمضان کے مکمل اور ہر مہینے کے تین روزے رکھنا تھا۔

مؤلف فرماتے ہیں کہ اہل بیتؑ کی طرف سے اس بارے میں بکثرت روایات منقول ہیں کہ رمضان کے علاوہ حضورؐ سے منقول تمام روزے مسنون یا مستحب ہیں (فرض نہیں)

تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادقؑ نے "یا ایھا الذین آمنوا" کے معنیٰ اس طرح بیان فرمائے کہ "روزے خاص مومنوں کے لئے ہیں"۔

الفقیہ میں حفص سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہی امام جعفر صادقؑ کو یہ کہتے سُنا "اللہ تعالیٰ نے ہم سے پہلے کسی اُمت پر روزے فرض نہیں کئے" بلکہ صرف ان کے انبیاء پر فرض کئے تھے۔ اللہ نے اس ملتِ مسلمہ کو یہ فضیلت عطا فرمائی کہ ماہ رمضان کے روزے اس امت اور اس اُمت کے رسولؐ دونوں پر فرض فرمائے۔

مؤلف المیزان فرماتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس کا راوی اسماعیل بن محمد جیسا انسان ہے جو قابلِ اعتبار نہیں۔ اس مفہوم کی ایک اور روایت ہے کہ وہ بھی مرسل ہے اس کی سند ہی مذکور نہیں۔ غرض یہ روایت احاد کی قسم کی ہے اور آیت کا ظاہر بھی اس کی تائید نہیں کرتا کہ

گذشتہ اقوام پر نہیں صرف انبیاءؑ پر روزے فرض کیے گئے تھے۔

تفسیر عیاشی میں ہے کہ امامؑ نے فرمایا کہ فرقان کے معنی قرآن میں موجود ہر امر محکم اور آیات محکم ہیں اور کتاب سے مراد وہ آیات ہیں جو گذشتہ انبیا کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور خود لفظ فرقان بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ رمضان اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک اسم ہے اس لئے یہ کہنا مناسب نہیں کہ "رمضان آیا" یا "رمضان گیا" بلکہ رمضان کے ساتھ شہر (مہینہ) کا لفظ لگانا چاہیے لیکن یہ روایت خبر واحد ہے۔ حدیث غریب ہے نیز جن روایات میں اللہ کے اسماءِ حسنیٰ مذکور ہیں اُن میں رمضان کا ذکر موجود نہیں اور ائمہ کی روایت میں رمضان کا لفظ بہت آیا ہے۔ اور یہ بات بعید از قیاس ہے کہ راوی نے ہر جگہ رمضان سے قبل لفظ شہر گرا دیا ہو۔

تفسیر عیاشی میں صباح بن بنانہ سے مروی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "جو شخص اپنے گھر میں ہوتے ہوئے رمضان المبارک کو پالے اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان صورتوں کے علاوہ کسی صورت میں رختِ سفر باندھے:-

(۱) حج کے لئے (۲) عمرے کے لئے (۳) یا ایسے رزق کی تلاش میں ہو جس کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، کہ اللہ نے فرمایا ہے:

"جو شخص تم میں سے اس ماہ کو پائے تو اس میں روزہ رکھے۔"

مؤلف کہتے ہیں کہ یہ نہایت لطیف استنباط ہے اور امامؑ نے آیت کی بنا پر رمضان میں کسی اور مقصد کے لئے سفر کی کراہت پر استدلال فرمایا ہے یعنی اگرچہ اس کے علاوہ مقاصد کے لئے سفر جائز ہے، مگر مکروہ ہے۔

کافی امام علی ابن حسینؑ سے منقول ہے کہ سفر اور مرض کے روزے میں عوام الناس نے اختلاف کیا۔ بعض نے کہا کہ چاہے تو رکھے چاہے تو نہ رکھے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ ان دونوں حالتوں میں قطعاً روزہ نہ رکھے۔ اگر سفر یا مرض میں روزہ رکھا تو قضا لازم ہے۔ کیونکہ خدا نے خود یہ فرمایا کہ:

"تم میں سے جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی کے دن پورے کرے۔"

اہلِ عقل کے لئے کس قدر واضح طور پر بیان ہوا کہ "جو رمضان کو پائے وہ روزہ رکھے اور جو رمضان میں سفر کرے وہ روزہ ترک کرے۔"

تفسیر عیاشی میں ہے کہ ابو نصر نے کہا کہ میں نے امام علیہ السلام سے اس آیت کے معنی پوچھے ــــ "اور جو اسے مشکل سے رکھ سکتے ہیں وہ فدیہ ادا کریں ایک محتاج کی خوراک" ــــ آپ نے فرمایا اس سے مراد ایسا بوڑھا ہے جو روزہ رکھنے پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ اور ــــ مریض ہی تفسیر میں ہے کہ ــــ امام باقرؑ نے فرمایا: "اس سے مراد بہت بوڑھا اور ایسا شخص جسے پیاس نہ بجھنے کا مرض ہو۔" اسی تفسیر میں ہے کہ امامؑ نے فرمایا:

"اس سے مراد ایسی عورت ہے جو اپنے بچے کی جان جانے کا اندیشہ اندیشہ رکھتی ہو یا بہت بوڑھا آدمی۔"

(اس کے بعد مؤلف نے فقہی مسائل سے متعلق چند روایات نقل فرمائیں جن کے ترجمہ کی ضرورت نہیں کہ یہ چیزیں فقہ کی کتابوں میں مفصل موجود ہیں)۔

محاسن میں بعض راویوں سے مرفوعاً منقول ہے کہ اس آیت میں تکبیر سے مراد تعظیم اور ھدایت سے مراد ولایت ہے۔

مؤلف کہتے ہیں کہ ہدایت کے معنی ولایت بیان کرنا، جری کی قسم سے ہے (جری کے معنی مصداق پر مکمل تطبیق کے ہیں) ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تاویل ہو ۔ جیسا کہ بعض روایات میں عُسرٰ (سختی) کے معنی اللہ سے دشمنی اور دشمنانِ خدا سے دشمنی ہے اور یُسر (آسانی) کے معنی ولایت بیان کیے گئے ہیں ۔

کافی میں حفص بن غیاث سے منقول ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے ارشادِ الٰہی : " ماہِ رمضان جس میں قرآن نازل کیا گیا" کے بارے میں سوال کیا کہ قرآن تو تقریباً بیس سال میں نازل ہوا تو پھر یہاں قرآن کے نزول کے کیا معنی ہیں ؟ امامؑ نے فرمایا : " قرآن مجید بیت المعمور تک ایک ہی مرتبہ ماہِ رمضان میں نازل ہوا پھر وہاں سے بتدریج بیس سال کی مدت میں زمین پر نازل ہوا" ۔ پھر امام نے فرمایا کہ " رسول اللہؐ نے فرمایا کہ :

" صحفِ ابراہیمؑ رمضان کی پہلی شب میں، توراۃ رمضان کے چھ دن گذرنے پر، زبور رمضان کی اٹھارہ کو، اور قرآن رمضان کی تیئیسویں کو نازل ہوا" ۔

مؤلف کہتے ہیں کہ سیوطی نے درالمنثور میں متعدد طرق سے یہی روایت حضورؐ سے نقل کی ہے ۔

کافی اور فقیہہ میں یعقوب سے مروی ہے کہ میں نے ایک شخص کو امام جعفر صادقؑ سے لیلۃ القدر کے بارے میں سوال کرتے سنا کہ شبِ قدر گذر چکی یا ہر سال آتی ہے ؟ امام نے فرمایا :

" اگر شبِ قدر اٹھالی جاتی تو قرآن بھی اٹھالیا جاتا" ۔

تفسیر درالمنثور میں ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا :

"لیلۃ القدر ہی لیلۃ المبارکہ، اور اسی شب
میں قرآن یکبارگی ــــ بیت المعمور کی طرف نازل کیا گیا،
بیت المعمور آسمانِ دُنیا کے ستاروں کے ڈوبنے کی جگہ ہے۔
قرآن مجید وہیں رہا۔ پھر محمدؐ پر امرِ الٰہی کی صورت میں حسبِ ضرورت
مختلف مواقع پر نازل ہوا۔"

مولف کہتے ہیں کہ یہ مفہوم ابنِ عباسؓ کے علاوہ سعید بن جبیر وغیرہ سے
بھی مروی ہے۔ (پھر مؤلف نے قرآن کی اُن آیات کا حوالہ دیا ہے جن سے
ابنِ عباسؓ نے غالبًا یہ نظریہ اخذ فرمایا تھا)۔

آخر میں مولف فرماتے ہیں کہ ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری
ہے کہ احادیث میں بھی قرآن کی طرح محکم متشابہ ہیں جن میں رمز و اشارات
پائے جاتے ہیں خصوصًا لوح، قلم، حجابات، آسمان، بیت المعمور،
بحرِ مسجور وغیرہ کے بیان میں۔ اس لئے صاحبانِ عقل کے لیے ضروری ہے
کہ قرائنِ کلام پر بہت غور و فکر کریں تاکہ مفہوم واضح ہو سکے۔

الصَّوم

ضمیمہ از مترجم
ڈاکٹر محمد حسن رضوی

الصّوم کے اصل معنی کسی کام سے رک جانا، باز رہنا ہوتا ہے خواہ اس کا تعلق کھانے پینے، چلنے پھرنے یا گفتگو کرنے سے ہو۔ اس بنا پر اگر گھوڑا چلنے سے رک جائے تو بھی اُسے صائم کہتے ہیں۔ عرب شاعر نے کہا
خیل صیام و اُخریٰ غیر صائمۃ " یعنی کچھ گھوڑے اپنے تھان پر کھڑے ہیں اور دوسرے میدانِ جنگ میں ہیں"۔
اصطلاحِ شریعت میں کسی انسان کا اختیاری نیت کے ساتھ صبح صادق سے لے کر رات کی ابتداء تک کھانے پینے جماع اور قے کرنے سے رُک جانے کا نام صوم ہے۔
(ملخص از مفردات امام راغب)

بہرحال روزہ کی تعریف سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ روزہ نفسانی خواہشات پر گرفت کو مضبوط کرنے کا عملی طریقہ ہے جس کا اثر مجموعی زندگی پر پڑتا ہے۔

لِاَنَّہٗ یکسر الشھوۃ " اسلئے کہ یہ خواہشات کے زور کو توڑتا ہے"
اور اس طرح ہمارے افعال و حرکات میں ضبط و نظام پیدا ہوتا ہے جو تقویٰ کی بنیاد ہے۔

جب رُوح کی گرفت انسان پر کمزور پڑ جاتی ہے اور اس کے اثرات کم ہونے لگتے ہیں تو انسان پر جسمانی تقاضے حکمرانی کرنے لگتے ہیں پھر انسان خواہشاتِ نفس اور لذت پسندی کے دھارے میں بے قابو ہو کر بہنے لگتا ہے۔ مویشیوں کی طرح ہر جگہ منہ مارتا ہے۔ اس کی تمام تر صلاحیتیں، ذہانت کھانوں کو زیادہ سے زیادہ پُر تکلف بنانے پر صرف ہوتی ہے۔ بالآخر وہ تمام مادی خوشیوں کے باوجود صرف اس لئے کماتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کھا سکے اور اس لئے کھاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کما سکے۔ بقول قرآن:

"اور جو کافر ہیں وہ عیش کر رہے اور کھا رہے ہیں
جس طرح چوپائے۔ اور آگ ہی ان کا ٹھکانا ہے۔"

(سورہ محمد ۱۲)

ایسا انسان شریعت کی ہر بندش، اخلاق و رُوحانیت کی ہر گرفت سے آزاد ہو کر مادہ اور معدے کے تیز دھارے میں بہنے لگتا ہے اس کے دل اور رُوح کی انگیٹھیاں بالکل سرد اور عقل و ضمیر بالکل شل ہو جاتا ہے۔ معدہ اتنا طول و عرض اختیار کر لیتا ہے کہ پورے پورے خاندان کی غذا ایک انسان کی ہوس کے لئے ناکافی ہوتی ہے۔ انسان ایک بے رحم پھاڑ کھانے والا درندہ بن جاتا ہے جو خود اپنے خاندان کے افراد کو پھاڑ کھاتا ہے تاریخ کی جنگیں اور خونریزیاں اس کی گواہ ہیں جو شخصی یا قومی انانیت، جماعتی عصبیت، حرص و طمع، توسیع پسندانہ جذبات، اقتدار کی ہوس اور طاقت کے جنون کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

ایسے انسان پر حیوانی جبلّت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس کے احساسات،

جذبات، اعصاب سب حیوانی جبلتوں کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ پھر اس کے نفس پر وہ چیز گراں اور شاق ہوتی ہے جو اس کی خواہش کی راہ میں مزاحم ہو یا اس کو اس کا انجام یاد دلائے۔ اس کی پوری عمر گذر جاتی ہے مگر زندہ ضمیر کا کوئی لمحہ اُسے نصیب نہیں ہوتا۔ عبادت اور ذکرِ الٰہی اس کی طبیعت پر سخت بار گذرتا ہے۔

روزہ اسے معدہ کی قساوت اور خواہشاتِ نفسانی کی گرفت سے پاک کر کے اُسے مقصدِ زندگی کی تکمیل کے لئے نئے سرے سے تیار کرتا ہے۔ مقصدِ زندگی عبادت ہے عبادت کا کمال ولایت ہے روزہ اسے ہر سال معدہ پرستانہ مادیت میں کمی کر کے روح کی کھوئی ہوئی نشاط اور قوت کو دوبارہ زندہ کرتا ہے اور اس طرح زندگی میں اعتدال پیدا کر کے خود غرضی کا سدِ باب کرتا ہے۔ کچھ دیر ہی کے لئے انسان کے اندر اخلاقِ الٰہی کا عکس اتار کر اُسے ملائکہ سے بھی بلند کر دیتا ہے۔

علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں

روزہ سے مقصود یہ ہے کہ نفس انسانی خواہشات اور بندھی ٹکی عادتوں کے شکنجے سے آزاد ہو سکے۔ اس کی شہوانی قوتوں میں اعتدال اور توازن پیدا ہو۔ تاکہ وہ اس طرح سعادتِ ابدی کے گوہر مقصود تک پہنچ سکے اور اسے یہ بات بھی یاد آئے کہ کتنے مسکین ہیں جو نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔ پھر وہ اپنے اعضاء کو ان چیزوں سے روک لے جس میں دنیا و آخرت کا

نقصان ہے۔ اس لئے روزہ اہلِ تقویٰ کی لگام، مجاہدین کی ڈھال اور مقربین کی ریاضت ہے۔"

۲۔ • دوسرے یہ کہ روزہ ایمان کی مضبوطی کا سبب ہے۔ اس لئے روزہ کی فرضیت کی آیت اس وقت آئی، جب اسلام کا عقیدہ دلوں میں اچھی طرح پیوست ہوچکا۔ توحید ان کے رگ و ریشہ میں سما گئی۔ چنانچہ ہجرت کے دوسرے سال روزے کا حکم آیا۔ ایمان کا کمال تقویٰ ہے اور تقویٰ وہ منزل ہے جہاں آدمی کامل ہوکر خواہشات کی لگام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ پھر خواہشات اس پر حکومت نہیں کرتیں۔ بلکہ وہ خواہشات پر حکومت کرتا ہے۔ جب وہ محض اللہ کے حکم پر مباح اور پاک چیزوں کو ترک کر دیتا ہے تو ممنوعات و محرکات سے بچنے کی کوشش کیوں نہ کریگا؟ جو شخص ٹھنڈے میٹھے پانی اور پاکیزہ لذیذ غذا کو خدا کی فرمانبرداری میں چھوڑ سکتا ہے وہ حرام، نجس اور گندی چیزوں کو خدا کے حکم پر کیوں نہ چھوڑیگا اور یہی لعلکم تتقون (تاکہ تم متقی ہوجاؤ) کا مفہوم ہے جو ایمان کا ثمر اور حاصل ہے۔

۳۔ • روزہ اخلاصِ عمل کی بڑی اچھی عملی مشق ہے۔

حضورؐ نے فرمایا:

"رمضان میں ابن آدم کا ہر عمل کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے اور اس کی نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھا دی جاتی ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ روزہ خاص میرے لئے ہے۔ میں خود اس کا یہ روزہ قبول کروں گا کیونکہ روزہ دار صرف میرے لئے

اپنا کھانا اور اپنی خواہش نفس سب چھوڑ دیتا ہے۔

روزے دار کے لئے دو خوشیاں ہیں۔ ایک افطار کے وقت اور ایک اپنے رب سے ملاقات کے وقت۔ بیشک روزہ دار کے منہ کی بوُ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک سے اچھی اور پاکیزہ ہے۔ (صحاح ستہ)

(گویا روزہ اخلاص سے محبت الٰہی تک بندے کو لے جاتا ہے۔ یہ محبت کی دنیا ہے جہاں منہ کی بوُ مشک سے پاکیزہ ہو جائے۔) مترجم

ہے۔ مگر یہ سب کچھ جبھی ہوتا کہ روزہ دار ایمان واحتساب کے ساتھ روزہ رکھے جس کی شرط خود حدیث میں لگائی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ روزہ دار اللہ کی خوشنودی کی خاطر اس کے ثواب کی امید رکھتے ہوئے اس کے وعدہ پر یقین کے ساتھ روزہ رکھے۔ اس لئے حضورؐ نے روزہ کو کئی شرطوں سے مشروط فرمایا ——— دل وزبان کی عفت پر زور دیا۔ حضورؐ نے فرمایا:

"جب تم میں کوئی روزے سے ہو تو نہ بدکلامی کرے نہ شور وشر۔ اگر کوئی گالی بھی دے اور لڑنے جھگڑنے پر اتر آئے تو کہدے کہ میں روزہ سے ہوں۔"

یہ بھی فرمایا کہ: "جس نے جھوٹ بولنا، غیبت کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑے۔" (بخاری شریف)

آپؐ نے یہ بھی فرمایا: "کتنے روزہ دار ہیں جن کو ان کے روزے نے سوا بھوک پیاس کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

"اور کتنے عبادت گذار ہیں جن کو اپنے رات بھر کھڑے رہنے میں شب بیداری کے سوا کچھ نہیں ملتا۔"

(بخاری۔ ابو داؤد۔ ترمذی)

حضورؐ نے یہ بھی فرمایا : "روزہ ڈھال ہے جب تک
اس کو پھاڑ نہ ڈالا جائے" سوال ہوگا کہ کس طرح
پھاڑ ڈالے ؟ فرمایا کہ جھوٹ یا غیبت سے۔ (نسائی)

۵ ۔ • پھر روزہ میں صرف سلبی امور ہی نہیں اکتسابی امور بھی ہیں
عبادت، تلاوت، ذکر، تسبیح، غمخواری، دوسروں کی
خیرخواہی، غربا پروری۔ حضورؐ نے فرمایا :

"اس مہینے میں جو شخص کسی ایک خصلت نیک
یا عمل سے خدا کا تقرب حاصل کرنا چاہے گا تو اس کا
ایک فرض غیر دنوں میں ستر فرض ادا کرنے کے برابر
ہوگا اور صبر کا بدلہ جنت ہے، یہ غمخواری کا مہینہ ہے"
(راوی سلمان فارسی از بیہقی)

حضورؐ نے یہاں تک فرمایا :

"روزے دار کو روزہ افطار کرائے، اس کو
روزے دار کے برابر اجر ملے گا جبکہ روزے دار
کے اجر میں کوئی کمی نہ کی جائیگی۔ (ترمذی)

(ملخص از ارکان اربعہ۔ ابوالحسن علی ندوی)

روزے میں سنت نمازوں اور تلاوت اور آیاتِ قرانی پر تدبر کرنے
کی بڑی تاکید فرمائی گئی ہے۔

حضرت امام جعفرؒ سے پوچھا گیا کہ شب قدر کی سب سے
افضل عبادت کیا ہے ؟ تو فرمایا :
"آیات الٰہی پر غور و فکر کرنا۔ مقصود یہ ہے کہ

قلب قرآن کے ساتھ وابستہ ہو جائے اشتغال بالخلق سے رہائی نصیب ہو اشتغال با اللہ کی نعمت میسر آئے افکار و ترددات کی جگہ اللہ کی محبت اور ذکر لے لے۔ غیر اللہ کے اُنس کے بجائے اللہ سے اُنس پیدا ہو۔ تلاوتِ قرآن سے جمعیتِ خاطر، صفائی قلب، ملائکہ سے تشبہ، شب قدر کا حصول ہوتا ہے۔ یہ تلاوت قبر کی وحشت میں اسکی مونس اور غمخوار ہوتی ہے۔"

maablib.org

آیت کے الفاظ کا تفصیلی مطالعہ

مِنْ قَبْلِكُمْ

تم پر روزے فرض کیے گئے جیسا کہ اُن پر جو تم سے قبل ہوئے ہیں	روزہ کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے تقریباً ہر مذہب اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔

(انسائیکلو پیڈیا برطانیکا جلد ۹ صفحہ ۱۹۶)

اس سے یہ نتیجہ بھی نکلا کہ تزکیۂ نفس کے لئے روزہ اتنی ہی ضروری چیز ہے کہ ہر زمانے میں ہر رسول کی امت پر اس کو واجب کیا گیا۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ	تقویٰ نفس کی ایک مستحکم کیفیت کا نام ہے۔ جس طرح مضر غذاؤں اور بری عادتوں

سے بچنے کے نتیجے میں جسمانی صحت درست رہتی ہے اور مادی لذتوں سے لُطف اندوزی کی صلاحیت پوری طرح بیدار رہتی ہے۔ بھوک خوب لگتی ہے خون صالح پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ان چیزوں کو ترک کرنے سے جو رُوحانی اور اخلاقی صحت کے لئے مضر ہیں انسان رُوحانی حقیقی اور اُخروی نعمتوں اور لذتوں سے لُطف اُٹھانے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے۔ روزہ کا اصل مقصد یہی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی روزہ دوسری قوموں کے ادنیٰ مقصد سے رکھنے والے روزوں پر فضیلت رکھتا ہے۔ مسیحی اور یہودی روزوں کا مقصد کسی فوری بلا کو دفع کرنا بالخصوص رُوحانی کیفیت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہودی ناموسِ اعظم جیوئش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵ میں ہے

"قدیم زمانے میں روزہ یا تو بطور ماتم رکھا جاتا تھا اور
جب کوئی خطرہ درپیش ہوتا تھا اور یا جب سالک اپنے
اندر قبولِ الہام کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتا تھا۔"
(ملخص از تفسیر ماجدی)

لیکن اسلام میں روزہ کا حکم ایمان کی بنیاد پر دیا گیا اور تقویٰ کی
صلاحیت پیدا کرنے کو اس کا مقصد قرار دیا گیا۔ (سر ولیم میور نے لکھا)
"روزہ کی سختیاں برابر قائم ہیں خواہ وہ کسی موسم میں
پڑیں اور آجتک مشرق کے میدانوں میں چلچلاتی ہوئی دھوپ
اور جھلساتی ہوئی لوئیں، گرمیوں کے لمبے لمبے دنوں میں
محمدؐ کے پیرو صبح سے شام تک پانی کا ایک قطرہ حلق کے نیچے
نہیں اتارتے۔ اتنی سخت ریاضت قوتِ ایمانی اور
ضبطِ نفس کا پورا پورا امتحان ہے۔ (لائف آف محمدؐ ص ۱۹۳)

معنیٔ تقویٰ

تقویٰ کی اصل وقایت ہے جس کے معنی اپنی حفاظت
یا خودداری ہوتی ہے۔ امام راغب نے لکھا کہ وقایۃ کے معنی چیزوں کو
ان خطرات سے بچانا ہے جو انھیں نقصان و تکلیف پہنچائیں اس لیئے
تقویٰ کے معنی ہیں روح کو حفاظتی پردے میں رکھنا۔ تقویٰ کے معنی
خوف بھی لیئے جاتے ہیں حالانکہ خوف تقویٰ کا سبب ہے۔ شریعت میں
تقویٰ کا مطلب اپنے کو گناہوں سے بچا کر رکھنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں
نظم وضبط کی اس اندرونی طاقت کا نام تقویٰ ہے جس کے سبب انسان
اپنے کو ہر قسم کی برائی سے بچا لیتا ہے۔ اس لیئے تقویٰ وہی کام کرتا ہے

جو گاڑی میں ہینڈل کا کام ہے ــــ حضرت علیؑ نے فرمایا :ـ

"تقویٰ ایسے راہوار کے مانند ہے جس پر
اس کا مالک سوار ہو اور اس کی باگ ڈور بھی
اس کے ہاتھ میں ہو اور وہ اسے بہشت کے
اندر پہنچا دے"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۶)

اس تشبیہہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ تقویٰ گوشہ نشینی کا نام نہیں
بلکہ زندگی کے سفر کو جاری رکھتے ہوئے اپنی حفاظت کرنے کا نام ہے۔

حضرت علیؑ نے فرمایا :

"تقویٰ اور خوفِ خدا ہر بند دروازے کی
چابی، قیامت کے لئے ذخیرہ، شیطان کی بندگی
سے آزادی اور ہر ہلاکت سے نجات ہے۔
(نہج البلاغہ خطبہ ۲۳۳)

پھر تقویٰ کی شاخیں ہیں جیسے تقویٰ مالی، تقویٰ اقتصادی،
تقویٰ جنسی، تقویٰ اجتماعی اور تقویٰ سیاسی وغیرہ۔
(ملخص از تفسیر نمونہ)

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ اور جو لوگ اسے مشکل سے برداشت کر سکیں (اُن پر دوسرے دنوں کا شمار رکھنا لازم ہے)	یعنی روزے کا تحمل مشکل سے ہو، مشقت بہت زیادہ اٹھانی پڑے۔

مثلاً زیادہ بوڑھے یا حاملہ یا دودھ پلانے والی عورتیں۔ طاقت میں مفہوم یہ ہے کہ کام کرنے کی قدرت تو ہو مگر اس کے کرنے میں مشقت

بہت زیادہ ہو۔ حضرت ابن عباسؓ کی قرأت میں یطیقونہ،
سے مراد یکلفونہ ہے۔ مفسرین اس بات کو منسوخ نہیں مانتے۔
حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا:

قال ابن عباسؓ
ھو الشیخ الکبیر والمرأة الکبیرة
یستطیعان ان یصوما (ابن کثیر عن عطاء)

یعنی عباس نے فرمایا کہ یہ آیت بہت
بوڑھے مرد عورتوں کے بارے میں ہے، جو
روزہ نہیں رکھ سکتے۔

امام فخر الدین رازی نے بھی یہی تفسیر فرمائی
لفظ رمضان کے بارے میں مفسرین نے لکھا کہ رمضان کی
اصل رمض ہے اس کے معنی گرمی کی شدت اور جلانے کے ہیں۔
روزے کے سبب روزے داروں کی نفسانی برائیاں اور
کمزوریاں اور بالآخران کے گناہ جلا کر صاف کر دیئے جاتے ہیں۔
اس لئے روزوں کے مہینہ کو رمضان ہی قرار دیا گیا۔
(ماخوذ از تفسیر ایس۔ وی میر صاحب)

امام راغب اصفہانی نے اپنی کتاب مفردات میں بھی رمض کے
معنی سورج کی سخت تپش اور جھلسا دینے کے لکھے ہیں رمضت الغنم
کے معنی سخت گرمی میں باہر چرنے کے سبب بکریوں کے جگر زخمی ہو گئے۔
روزہ میں روزہ دار کی نفسانی خواہشات کو جھلسا کر زخمی
کر دیا جاتا ہے اور اس طرح بالآخر ہوائے نفسانی کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔

بندے کا اللہ کی طرف رجوع بڑھ جاتا ہے۔ اس میں صبر و شکر کی استعداد بڑھ جاتی ہے۔ اب وہ ترک گناہ کا سچے دل سے عزم کر سکتا ہے۔ ایجابی نیکیوں کے ذریعہ سابقہ گناہوں کی تلافی کر سکتا ہے اور اس طرح اللہ کی توجہات کو اپنی طرف جلب کر سکتا ہے اور اس طرح اس کی رحمت کے نتیجے میں اس کے سابقہ گناہ جھلس کر ختم ہو جاتے ہیں

حضورؐ نے فرمایا :

من صام شہر رمضان ایماناً و احتساباً غفر لہٗ ما تقدم من ذنبہٖ جو شخص ایمان اور طلبِ ثواب کی بنیاد پر روزے رکھتا ہے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں :

"میں کہتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ رمضان کے روزے رکھنے میں قوتِ ملکی کے غالب ہونے اور قوتِ بہیمی کے مغلوب ہونے کا قوی احتمال ہے اور یہ بات خدا کی رضامندی اور اس کے دریائے رحمت میں غرق ہو جانے کے لئے کافی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ نفس ایک حال سے دوسرے حال کی طرف متوجہ ہو۔"

اب حضورؐ کا یہ فرمانا کہ الصوم جنۃ روزہ ڈھال ہے

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں "میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ روزہ شیطان اور نفس کے ضرر سے بچا لیتا ہے۔"

(حجۃ البالغہ)

روزہ اور بائیبل

بائیبل کی آیات میں روزہ کا مقصد

"اپنی جان کو دکھ دینے، نفس کشی کرنے، گناہوں کی بنا کو کاٹنے، بڑے حادثوں کی یاد تازہ کرنے، فروتنی پیدا کرنے، اپنے کو سزا دینے، اللہ کی ہدایات کو حاصل کرنے کی استعداد پیدا کرنے، اپنے کو آزمائشوں کے لئے تیار کرنے، خدا کی خوشی کو حاصل کرنے، اللہ کی بڑی خدمت کی تیاری کرنے کو بتایا گیا ہے۔

(ملخص از قاموس الکتاب ۔ لغات بائیبل)

حضرتِ عیسیٰ نے فرمایا :

"جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت نہ بناؤ تاکہ لوگ تمہیں روزہ دار جانیں۔ ایسا کرنے میں وہ اپنا اجر پا چکے"۔

maablib.org

THE FOUNDATION FOR THE REVIVAL
OF ISLAMIC HERITAGE

مطبوعات ادارہ احیاء تراث اسلامی

[illegible]